واقعہ کی صحت پر روایتاً و درایتاً وارد شدہ اعتراضات کا علمی محاکمہ

گستاخ منافق
اور
سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اقدام

تالیف

علامہ محمد خلیل الرحمٰن قادری

ناظم اعلیٰ جامعہ اسلامیہ لاہور

K بلاک (99) جوہر ٹاؤن لاہور

گستاخ منافق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ

کا اقدام

(واقعہ کی صحت پر روایۃً ودرایۃً واردشدہ اعتراضات کا علمی محاکمہ)

تالیف

علامہ محمد خلیل الرحمٰن قادری

مکتبہ کریمیہ

(99)k بلاک جوہر ٹاؤن لاہور

نام کتاب	گستاخ منافق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اقدام
تالیف	علامہ محمد خلیل الرحمٰن قادری
پروف ریڈنگ	علامہ محمد اللہ بخش تونسوی قادری
حروف سازی	محمد عمران عنصر
ناشر	مکتبہ کریمیہ لاہور
اشاعت (باراوّل)	2019ء
تعداد	1100
قیمت	400

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ اہلِ سنت جامعہ نظامیہ لاہور ☆ مکتبہ والضحیٰ پبلی کیشنز اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ نبویہ دربار مارکیٹ لاہور ☆ چشتی کتب خانہ دربار مارکیٹ لاہور

☆ مکتبہ اعلیٰ حضرت دربار مارکیٹ لاہور ☆ سیالوی کتب خانہ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ کرماں والا دربار مارکیٹ لاہور ☆ مکتبہ ریاض الجنۃ اردو بازار لاہور

☆ مکتبہ قادریہ دربار مارکیٹ لاہور ☆ النوریہ الرضویہ پبلشنگ دربار مارکیٹ لاہور

فہرست

اھداء

یہ ناچیز اپنی اس ادنیٰ سی کوشش کو نبی رحمت، شافع روز جزا حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے حضور ہدیہ کرتا ہے۔ کل روزِ محشر میرے جیسے عاصی اور سیاہ کار انہی کی نگاہ التفات کے اُمیدوار ہونگے۔

گر قبول افتذ زہے عزوشرف

دعاؤں کا طالب

محمد خلیل الرحمٰن قادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مقدمہ

گستاخ رسول کی سزا کے حوالے سے اہل علم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین قسم کے اقدامات پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلی قسم ان بدبختوں سے متعلق ہے جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکانے لگانے کا حکم اپنی زبان اقدس سے دیا اور مختلف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان بدبختوں کو ٹھکانے لگایا۔

دوسری قسم میں وہ سب وشتم کرنے والے شامل ہیں جنہیں فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کے باوجود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکانے لگانے کا حکم دیا اور ان سے صرف نظر نہ فرمایا۔ تیسری قسم ان شاتمین کی ہے جن کا معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش نہ کیا گیا بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ازخود اقدام کرتے ہوئے ان شاتمین کو ٹھکانے لگا دیا۔ جب ان کے قتل کا معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خون کو رائیگاں قرار دیدیا اور انہیں قتل کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کوئی سزا نہ دی حتیٰ کہ معمولی سرزنش بھی نہ کی بلکہ بعض کی تو تحسین بھی فرمائی۔

کتب احادیث میں اس موخر الذکر نوع کے حوالے سے متعدد واقعات ملتے ہیں۔ایک واقعہ تو اس منافق کا ہے جس نے حضور ﷺ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تھا اور یہودی کے ساتھ اپنا معاملہ سیدنا عمرؓ کے پاس لے آیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تلوار اٹھائی اور اس منافق کا سر قلم کر دیا تھا۔ دیگر واقعات میں حضرت عمیرؓ بن عدی کا قبیلہ خطمیہ کی شاتمہ، حضرت عمیرؓ بن امیہ کا اپنی سابہ و مشرکہ بہن، نابینا صحابی کا اپنی شاتمہ اُم ولد کو از خود اقدام کرتے ہوئے قتل کرنا نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتب احادیث میں مذکور ان واقعات کی استنادی حیثیت پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن دیکھا گیا ہے کہ بعض متجددین ان روایات کی استنادی حیثیت کو مجروح کرنے کیلئے دور کی کوڑی لاتے ہیں اور بزعم خویش از روئے درایت بھی ان روایات پر اعتراضات وارد کرتے ہیں۔

ان کا زیادہ زور قلم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ والے واقعہ کو جھٹلانے یا بے بنیاد ثابت کرنے پر صرف ہوتا ہے۔شاید اس کا سبب یہ ہے کہ یہ وہ واحد واقعہ ہے جو ایک بظاہر مسلمان کے متعلق ہے اور آج کل مسلمان شاتم کو ماورائے عدالت قتل کرنے کے حوالے سے جو بھی کارروائیاں کی جاتی ہیں ان کی تائید وتصویب اسی واقعہ سے ہی میسر آتی ہے۔

یہ بات ہمیں بھی کھٹکتی ہے کہ جب علما اور وکلا کی طویل مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں قانون تحفظ ناموس رسالت بن چکا ہے اور توہین رسالت کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے ملک میں عدالتی نظام موجود ہے تو کسی بھی شاتم سے نمٹنے کیلئے قانونی کارروائی پر ہی اکتفا کرنا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ کتب احادیث میں سے یہ روایات ہی نکال دیں یا انہیں ناقابل احتجاج قرار دینے کیلئے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں۔

دوسرا اہم پہلو جو ان روایات سے جڑا ہوا ہے وہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کسی شاتم کی طرف سے کی جانے والی توہین پر قانونی راستہ اختیار کرنے کی عمومی روش کے باوجود اگر کوئی شخص وفورِ غیرت سے اس شاتم کو از خود اقدام کرتے ہوئے ماورائے قانون وعدالت قتل کر دیتا ہے تو اس کے معاملہ کو شریعت کیسے دیکھتی ہے؟ اگر اس نے واقعتاً توہین کے ارتکاب پر شاتم کو قتل کیا ہو اور وہ گواہان وٹھوس ثبوتوں کے ذریعے مقتول پر توہین کا الزام ثابت کر سکتا ہو تو کیا پھر بھی یہ قتل ناحق کہلائے گا اور قتل کرنے والے پر قصاص یا دیت لازم ہو گی یا نہیں؟ قاضی یا امام پر سبقت لینا کس نوعیت کا جرم قرار پائے گا؟ کیا اس کے سبب بھی قاتل کو موت کی سزا دی جا سکے گی خواہ اس نے گواہوں اور ثبوتوں کی روشنی میں واقعتاً ایک شاتم کو اشتعال میں آ کر قتل کیا ہو؟

متجد دین چونکہ بنیادی طور پر قانون تحفظ ناموس رسالت کے ہی خلاف ہیں اس لئے وہ اس پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کرتے رہتے ہیں۔کبھی کہتے ہیں کہ یہ سزا قرآن پاک کی کسی نص صریح سے ثابت نہیں، کبھی کہتے ہیں کسی صحیح روایت میں بھی یہ سزا مذکور نہیں ہے۔کبھی توہین کے مرتکب کی توبہ کی قبولیت کے مسئلہ پر فقہی اختلافات کی اوٹ میں چھپ جاتے ہیں تو کبھی مذکورہ بالا روایات کی استنادی حیثیت کو مجروح کرتے ہیں اور ان پر درایتاً اعتراضات وارد کرتے ہیں۔شاید وہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہوں کہ ایسا کرنے سے شاتم کے ماورائے قتل کو شرعی جواز فراہم نہیں ہو سکے گا لیکن ان کا دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ شریعت میری یا انکی خواہش کا نام نہیں ہے اور نہ ہی مسلمہ روایات کو خواہش نفس کے تابع ہو کر مجروح کیا جا سکتا ہے۔بحمد اللہ زیر نظر رسالہ میں ہم نے ادنیٰ سی کوشش کی ہے کہ متجددین کی طرف سے ان روایات پر جملہ اعتراضات کے جوابات شائستگی کے ساتھ دیدیں تا کہ احقاق حق ہو سکے۔ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ سزا کے نفاذ کا اختیار ریاست کے پاس ہے لیکن مباح الدم شخص کو حالت اشتعال میں قتل کرنا کیسا ہے اس کا بھی ٹھیک جائزہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں لینا چاہیے۔آخر میں ہم نے مشعال کے قتل کے حوالے سے لکھے گئے مضمون اور دیگر اہم تحاریر کو بھی شامل کر دیا ہے۔اس مضمون میں شاتم کے ماورائے عدالت قتل کے حوالے سے ہمارا نکتۂ نظر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

قانون توہین ناموس رسالت پر وقتاً فوقتاً اہل مغرب کی طرف سے اعتراضات وارد کیے جاتے ہیں اور ہماری حکومت سے اس قانون کو ختم کر دینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ تب سے جاری ہے جب سے یہ قانون بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی ہے کہ اس نے ہم سے ہمیشہ قانون تحفظ ناموس رسالت کے دفاع کی ٹوٹی پھوٹی خدمت لی ہے۔ اس کرم فرمائی پر اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ اسی مناسبت سے ہم نے اپنی وہ تحریریں جو وقتاً فوقتاً اس قانون کے دفاع کی غرض سے لکھی گئیں انہیں بھی آخر میں ذکر کر دیا ہے۔ ایک کھلا خط جو یورپین ممالک کے سربراہان کو لکھا گیا وہ بھی ان تحریروں میں شامل ہے۔ یہ مقدمہ اپنے محسن و مربی محقق العصر حضرت مفتی محمد خان قادری مدظلہ العالی کے ذکر کے بغیر ادھورا رہے گا جنہوں نے ہمیشہ اس ناچیز کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی فرمائی ہے۔ اللہ رب العزت ان کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر سلامت رکھے اور متلاشیان علم ان سے فیض پاتے رہیں۔ آمین۔

یہ بھی دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس ادنیٰ سی کوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

دعاؤں کا طالب

محمد خلیل الرحمٰن قادری

حافظ علامہ محمد عمار خان ناصر نے اپنی تالیف ''توہین رسالت کا مسئلہ'' میں کتب احادیث میں وارد بعض واقعات کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ قطعاً درست نہیں ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اس واقعہ پر تنقید کی ہے جو سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے منافق کو قتل کرنے کے حوالے سے تقریباً سبھی مفسرین نے بیان کیا ہے لیکن وہ اس واقعہ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

''ہمارے معاشرے میں پیشہ ور اور غیر محتاط واعظین نے جن بے اصل کہانیوں کو مسلسل بیان کر کے زبان زدِ عام کر دیا ہے، ان میں سے ایک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایک منافق کو قتل کرنے کا واقعہ بھی ہے۔ زیر نظر سطور میں محدثانہ نکتہ نظر سے اس واقعہ کی پوزیشن کو واضح کیا جا رہا ہے''۔

(توہین رسالت کا مسئلہ:۹۸)

واقعہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ والی روایات پر جرح

پھر انہوں نے جن تین روایات کے ذریعے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے ان کی استنادی حیثیت پر گفتگو کی ہے انہوں نے ابن ابی حاتم رحمہما اللہ کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے اور اس کے آخری راوی ابو الاسود محمد بن عبد الرحمٰن نوفل ہیں جن کے بارے میں محدث ابن البرقی فرماتے ہیں کہ اگر چہ

زمانی لحاظ سے امکان موجود ہے لیکن عملاً کسی صحابی سے ان کی کوئی روایت ہمارے علم میں نہیں ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں عبداللہ بن لہیعہ رحمہ اللہ جیسا ضعیف راوی موجود ہے۔ انہوں نے اپنے اس مؤقف کی تائید میں امام نسائی، خطیب، امام مسلم، حاکم اور ابن حبان کی جرح بغیر کسی حوالے کے نقل کی ہے۔ ابن حبان کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کی روایات کو جانچ پرکھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تدلیس کرتے ہوئے درمیان کے کمزور راویوں کو حذف کر کے براہ راست ثقہ راویوں سے روایت نقل کر دیتا ہے۔

اسی طرح انہوں نے حافظ ابو اسحاق کی نقل کردہ روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی منقطع ہے کیونکہ آخری راوی ضمرہ بن حبیب تابعی ہیں اور صحابی کا واسطہ موجود نہیں۔ نیز سند کے ایک راوی ابو المغیرہ عبدالقدوس بن الحجاج الخولانی کے بارے میں ابن حبان کی رائے یہ ہے کہ وہ حدیثیں گھڑ کر ثقہ راویوں کے ذمہ لگا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ کسی سند کے بغیر حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں مکحول رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور وہ بھی تابعی ہیں اور کسی صحابی کے واسطہ کے بغیر نقل کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے بارے میں محدثین کی رائے یہ ہے کہ یہ اکثر تدلیس کرتے ہوئے صحابہ سے روایات نقل کر دیتے ہیں حالانکہ وہ روایات خود ان سے نہیں سنی ہوتیں۔

انہوں نے از روئے درایت بھی ان روایتوں پر اعتراضات وارد کیے ہیں جن کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے تا کہ ان روایات کی اسناد پر موصوف کی طرف سے نقل کی جانے والی جرح پر پہلے بات کرلی جائے۔

سب سے پہلے تو موصوف کے اس قول کا جائزہ لیتے ہیں:

"ہمارے معاشرے میں پیشہ ور اور غیر محتاط واعظین نے جن بے اصل کہانیوں کو مسلسل بیان کر کے زبان زدِ عام کر دیا ہے، ان میں سے ایک سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایک منافق کو قتل کرنے کا واقعہ بھی ہے۔"

کیا یہ سب مفسرین پیشہ ور اور غیر محتاط واعظین ہیں؟

اس واقعہ کو جاہل، پیشہ ور اور غیر محتاط خطیبوں کے کھاتے میں ڈالنے سے قبل موصوف کو کتب تفاسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے تھا تا کہ ان کو پتہ چل جاتا کہ تقریباً سبھی جید مفسرین نے اس واقعہ کو سورۃ النساء کی آیت نمبر 60 کے شان نزول کے طور پر بیان کیا ہے۔

امام ابو منصور محمد ماتریدی حنفی (ت: ۳۲۳ھ) نے "تاویلات اهل السنة" امام عبدالرحمٰن محمد المعروف امام ابن ابی حاتم (ت: ۳۲۷ھ) نے "تفسیر قرآن العظیم" اور امام طبرانی (ت: ۳۶۰ھ) نے امام کلبی کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے جسے "تفسیر کبیر" میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح امام ابو اللیث سمرقندی (ت: ۴۰۰ھ) نے "تفسیر بحر العلوم" میں۔ امام ثعلبی (ت: ۴۲۷ھ)

نے امام کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی واقعہ نقل کیا ہے۔اسی کا حوالہ "الکشف البیان" میں موجود ہے۔امام ابوالحسن علی بن محمد ماوردی (ت:۴۵۰ھ) نے یہ واقعہ سورۃ النساء کی آیت نمبر 62 کے ایک سبب نزول کے طور پر بیان کیا ہے اسی کا حوالہ "تفسیر الماوردی" میں دیکھا جا سکتا ہے۔امام بغوی رحمہ اللہ (ت:۵۱۶ھ) نے "تفسیر معالم التنزیل" میں،امام زمخشری (ت:۵۲۸) نے "الکشاف" میں،امام ابو محمد عبدالحق بن عطیہ اندلسی (ت:۵۴۶ھ) نے "تفسیر المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز" میں،امام عبدالرحمٰن بن علی بن جوزی (ت:۵۹۷ھ) نے "زاد المسیر" میں،امام رازی رحمہ اللہ (ت:۶۰۶ھ) نے "تفسیر کبیر" میں کثیر مفسرین کے حوالے سے یہ واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی نقل کیا ہے۔امام قرطبی (ت:۶۷۱ھ) نے "تفسیر الجامع لاحکام القرآن" میں،امام بیضاوی (ت:۶۸۵ھ) نے "تفسیر بیضاوی" میں،امام خازن (ت:۷۲۵ھ) نے "تفسیر لباب التاویل" میں،امام نظام الدین حسن نیشاپوری (ت:۷۲۸ھ) نے "تفسیر غرائب القرآن" میں،امام ابوحیان اندلسی (ت:۷۴۵ھ) نے "البحر المحیط" میں،امام ابوحفص عمر بن عادل حنبلی (ت:۸۸۰ھ) نے "اللباب فی علوم الکتاب" میں اور امام جلال الدین سیوطی (ت:۹۱۱ھ) نے "الدر المنثور" میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔اسی طرح امام خطیب شربینی (ت:۹۷۷ھ) نے "السراج المنیر" میں اور علامہ آلوسی (ت:۱۲۷۰ھ) نے "روح المعانی" میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔

کیا یہ سارے مفسرین موصوف کے نزدیک پیشہ ور خطیب اور غیر محتاط واعظین تھے؟ اگر نہیں تو پھر آج کے خطباء اور واعظین پر پیشہ ور اور غیر محتاط ہونے کی پھبتی کس بنیاد پر؟ اس قدر حوالہ جات کے بعد کم از کم غیر محتاط ہونے کی پھبتی تو خود ان کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

ا۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم کی روایت پر جرح کا جائزہ

اب پہلے ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم کی روایت پر ان کی جرح کا جائزہ لیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے اور اس کے آخری راوی ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن نوفل کے بارے میں محدث ابن البرقی فرماتے ہیں کہ اگرچہ زمانی لحاظ سے امکان موجود ہے لیکن عملاً کسی صحابی سے ان کی کوئی روایت ہمارے علم میں نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ امام مسلم کے نزدیک فقط معاصرت شرط ہے۔ ملاقات کی شرط امام بخاری عائد کرتے ہیں اور محدث ابن البرقی یہ فرما رہے ہیں کہ زمانی لحاظ سے ان کی صحابی کے ساتھ معاصرت کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا علی شرط مسلم یہ روایت قابل قبول قرار پاتی ہے۔

اُصولاً تو ابن البرقی کا یہ قول ان پر جرح بنتی ہی نہیں کیونکہ ان کی صحابہ سے معاصرت وہ خود مان رہے ہیں جبکہ ان کا صحابہ سے روایت کرنے کا علم نہ ہونا یہ لازم نہیں کرتا کہ انہوں نے صحابہ سے حدیث لی ہی نہیں کیونکہ عدم علم سے عدم وجود لازم نہیں آتا

یہاں موصوف کی علمی دیانت مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ ابن البرقی کا قول بیان کرنے سے پہلے ابن حجر نے ''تھذیب التھذیب ''میں تابعی ابوالاسود محمد بن عبد الرحمٰن نوفل ان کی تعدیل بہت کھل کر بیان کی ہے۔ہم ان کی توجہ کے لیے وہ کلمات توثیق یہاں نقل کر دیتے ہیں۔

وقال ابن ابی حاتم : سأل ابی عنه، فقال : ثقة۔ قیل له : یقوم مقام الزهری وهشام بن عروة؟ فقال : ثقة۔ وقال النسائی : ثقة وقال الواقدی: مات فی آخر سلطان بنی اُمیة۔ وذکره ابن حبان فی الثقات۔قلت: وزعم انه توفی سنة سبع عشرة ومائة وهذا وهم لامریة فیه، والأشبه ان یکون من سقم النسخة وکأنها کانت سنة سبع وثلاثین، وقال الغراب : مات سنة احدی وثلاثین وقال ابن سعد بعد ان

اور ابن ابی حاتم نے کہا: میں نے اپنے والد سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا یہ ثقہ ہیں ان کو کہا گیا کہ یہ زہری اور ہشام بن عروہ کے قائم مقام ہیں؟ انہوں نے کہا، یہ ثقہ ہیں۔امام نسائی نے کہا، یہ ثقہ ہیں۔واقدی نے کہا، یہ بنواُمیہ کے آخری بادشاہ کے دور میں فوت ہوئے، ابن حبان نے ''کتاب الثقات'' میں ان کا ذکر کیا ہے، میں کہتا ہوں: ان کا خیال ہے کہ یہ ۱۱۷ھ میں فوت ہوئے اور یہ ان کا وہم ہے اور زیادہ شبہ یہ ہے کہ سقم کی وجہ سے ہے گویا کہ یہ یوں تھا (۳۷ھ) قراب نے کہا، یہ ۳۱ھ میں فوت ہوئے۔

ذکر وفاته عن الواقدی:

ليس له عقب وكان كثير الحديث ثقة، وقال ابن شاهين في الثقات : قال احمد بن صالح : هوثبت له شأن

(تهذيب التهذيب :۵۔۱۹۸)

ابن سعد نے ان کی وفات ذکر کرنے کے بعد امام واقدی کے حوالہ سے کہا، ان کی پیچھے اولاد نہیں تھی اور یہ کثرت کے ساتھ احادیث بیان کرنے والے تھے اور ثقہ تھے۔ امام ابن شاہین نے ''کتاب الثقات'' میں کہا کہ احمد بن صالح نے کہا یہ مضبوط راوی ہیں اور شان وشوکت والے تھے۔

عبداللہ بن لہیعہ پر جرح کا جائزہ

جہاں تک عبداللہ بن لہیعہ پر ان کی نقل کردہ جرح کا تعلق ہے تو ہم نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات لکھ رہے ہیں کہ موصوف نے یا تو ان پر جرح تو پڑھ لی لیکن تعدیل ان کی نظر سے نہیں گزری یا انہوں نے عمداً ان پر محدثین کی تعدیل نقل نہیں کی۔ الغرض صورت جو بھی ہو یہ ایک محقق کے شایان شان نہیں۔ ہم یہاں ان کے بارے میں محدثین کی تعدیل کا ذکر کردیتے ہیں۔

عظیم محقق حسن مظفر الرزو نے ''امام المحدث عبدالله بن لهيعه'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے نہ صرف ابن لہیعہ کی تعدیل کرنے والے جید محدثین وائمہ کا مفصل ذکر کیا ہے اور ان کے کلمات تعدیل کو نقل کیا بلکہ ان پر اہل علم کی طرف سے کی جانے والی جرح کا بھی تشفی جواب دیا ہے۔ مثلاً

امام مالک رحمہ اللہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ مؤطا کے شارحین امام محمد بن احمد الباقی مالکی اور امام جلال الدین سیوطی رحمہما اللہ بھی انہیں ثقات میں ہی شمار کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے انہیں مصر کا سب سے بڑا محدث اور ضبط واتقان میں بے مثل مانا ہے۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے تو امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے یہاں تک نقل کیا ہے کہ مصر میں محدث صرف ابن لہیعہ رحمہ اللہ ہیں۔ ابن لہیعہ کے وصال پر ابن لیث بن سعد نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بعد اپنی مثال نہیں چھوڑی۔ امام عبداللہ بن وہب کو شیخ ابوطاہر بن حرہ نے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم مجھے سچے اور صالح عبد اللہ ابن لہیعہ نے حدیث بیان کی ہے۔ شیخ ابوطاہر کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پہلے ابن وہب کو کبھی قسم اُٹھاتے نہیں دیکھا۔ امام یحییٰ کو ان کے بیٹے امام محمد بن یحییٰ بن حسان نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے ہشیم کے بعد ابن لہیعہ سے بڑھ کر صاحب حفظ نہیں دیکھا۔

امام ابن حبان کا کلمات تعدیل سے گریز کیوں؟

حد تو ہے کہ موصوف نے اپنا مطلب نکالنے کے لیے امام ابن حبان کے ابن لہیعہ کے بارے میں کلمات جرح کو تو نقل کر دیا لیکن انہوں نے ابن لہیعہ کی جو مشروط تعدیل کی اسے بیان ہی نہیں کیا، شاید اس لیے کہ ایسا کرنے سے ان کا زیر بحث روایت پر اعتراض دم توڑ جاتا۔ ہم اس بات کو واضح کیے دیتے ہیں۔ امام ابن حبان نے لکھا کہ چار ... اصحاب ... فرماتے ہیں:

سماع من سمع منه قبل احتراق کتبه مثل العبادلة: عبدالله بن وهب وابن البارك وعبدالله بن يزيد المقرى وعبدالله بن مسلمة القعنبى فسماعهم صحيح

(میزان الاعتدال:۴_۱۷۳)

ابن لہیعہ سے جن لوگوں کا سماع ان کی کتب جلنے سے پہلے ہے مثلاً یہ چار عبادلہ عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن یزید المقری اور عبداللہ بن مسلمہ قعنبی۔تو ان لوگوں کا سماع درست ہے۔

شیخ ناصرالدین البانی کی مشروط تعدیل

شیخ ناصرالدین البانی نے بھی متعدد مقامات پر ان کی مشروط تعدیل کا ذکر کیا ہے البتہ انہوں نے ابن لہیعہ سے تین عبادلہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے یعنی عبداللہ بن مسلمہ قعنبی کو شامل نہیں کیا۔ مثلاً ایک مقام پر وہ ابن لہیعہ سے مروی روایت کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ روایت ابن لہیعہ سے اس لیے صحیح ہے کہ اسے ان سے عبادلہ نے روایت کیا ہے۔

قلت ورجاله ثقات لان ابن لهيعة صحيح الحديث اذا روى عنه العبادلة: عبدالله بن وهب وعبدالله بن مبارك وعبدالله بن يزيد المقرى وهذا الحديث من رواية الاولين عنه

(سلسلة الاحاديث الضعيفه:۸_۱۹۹)

میں کہتا ہوں کہ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں کیونکہ ابن لہیعہ صحیح الحدیث ہوتا ہے جب ان سے یہ عبادلہ روایت کریں، عبداللہ بن وہب، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن یزید مقری اور یہ حدیث ابن لہیعہ سے پہلے دونوں روایت کرنے والے ہیں۔

یہ صرف شیخ ناصر الدین البانی کا ہی مؤقف نہیں بلکہ وہ لکھتے ہیں کہ اس پر متعدد ائمہ نے تصریح کی ہے۔

ابن لهيعة وان كان ضعيفاً فان رواية العبادلة الثلاثة عنه صحيحة كما نص على ذالك غير واحد من الائمة	ابن لہیعہ اگرچہ ضعیف ہے لیکن ان سے تین عبادلہ کی روایت صحیح ہے جیسے اس پر متعدد ائمہ نے تصریح کی ہے۔

(سلسلة الاحاديث الضعيفه:۲۔۴۲۴)

اب زیر بحث روایت کی سند دیکھیں۔ اس میں ابن لہیعہ سے روایت کرنے والے حضرت عبداللہ بن وہب ہیں لہذا اس پر موصوف کی طرف سے وارد یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے کہ ابن لہیعہ ضعیف ہیں۔

امام مکحول رحمہ اللہ پر جرح کا جواب

یہاں کچھ بات ''نوادر الاصول'' میں منقول روایت پر بھی [illegible]ہ جائے۔ اس پر موصوف نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ بغیر کسی سند کے مکحول رحمہ اللہ سے منقول ہے اور ان کے بارے میں محدثین کی رائے یہ ہے کہ وہ اکثر تدلیس کرتے ہوئے صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے وہ روایات خود ان سے نہیں سنی ہوتیں۔

اُصولی طور پر تو انہیں ان محدثین کا نام بھی ظاہر کرنا چاہیے تھا اور حوالہ بھی دینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے یہاں کسی محدث کا نام لیے بغیر یہ جرح محدثین کے کھاتے میں ڈال دی ہے، ہم نے اپنے طور پر مکحول پر وارد جرح وتعدیل کا بغور جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں یہ بات ابن حبان سے ملی ہے انہوں نے "کتاب الثقات" میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں لکھا ہے:

و کان من فقھاء اھل الشام	اور آپ اہل شام کے فقہاء میں سے تھے اور
وربما دلّس	بعض اوقات تدلیس (ارسال) کرتے تھے۔

لیکن ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی "الصحیح" (الاحسان) میں مکحول سے کئی روایات لی ہیں۔ اسی طرح کی بات حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی کی ہے لیکن ان کو ثقہ بھی قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں:

ثقة فقیه کثیر الارسال مشهور (تقریب التهذیب:۶۸۷۵)	ثقہ فقیہ ہیں اور ان کا کثیر الارسال ہونا مشہور ہے۔

اگر راوی ثقہ ثابت ہو جائے تو اس کا کثیر الارسال ہونا اس پر جرح نہیں ہے، بلکہ راوی ثقہ ہو یا اوثق مرسل روایت ضعیف اور صحیح متصل روایت صحیح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی توثیق کرنے والوں میں بڑے بڑے محدثین شامل ہیں۔

امام ابوالحسن العجلی رحمہ اللہ (ت:۲۶۱ھ) نے امام مکحول کے بارے میں فرمایا:

تابعی ثقة یعنی ثقہ تابعی ہے۔

(التاریخ المشہور بالثقات:۱۷۸۴)

امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم میں ان سے بطور حجت روایات لیں۔

دارالاسلام کی ترقیم کے مطابق حدیث رقم:۹، ۱۳۷۷، ۹۸۲ اور ۱۹۱۳، ملاحظہ ہوں۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے ایک روایت کے بارے میں فرمایا:

کلھم ثقات اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

(سنن دارقطنی:۱۔۱۲۰۴)

اس روایت کی سند میں مکحول رحمہ اللہ بھی ہیں۔لہذا یہ امام دارقطنی رحمہ اللہ کی طرف سے ان کی بالواسطہ توثیق ہے۔

امام ترمذی نے مکحول رحمہ اللہ کی توثیق کرتے ہوئے ان کی بیان کردہ حدیث کو حسن صحیح کہا۔(ملاحظہ ہو۔حدیث رقم:۱۹۲)

امام ابن خزیمہ نے "صحیح ابن خزیمہ" میں مکحول سے کئی روایات بطور حجت بیان کی ہیں۔ (ملاحظہ ہو: حدیث رقم:۳۷۷۔۱۱۹۱۔۱۵۸۱)

امام حاکم رحمہ اللہ نے مکحول کی بیان کردہ حدیث کو صحیح الاسناد کہا۔

(ملاحظہ ہو:المستدرک۔جلد دوم۔ص:۹۰۔حدیث:۲۴۲۲)

امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اس پر موافقت کی بلکہ ان کی مستقلاً توثیق فرماتے

ہوئے لکھا:

صدوق امام موثوق لکن ضعفه ابن سعد — سچے امام اور توثیق شدہ ہیں لیکن ابن سعد نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔

(معرفة الرواة المتكلم منهم بما لا يوجب الرد:۳۳۸)

امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے مکحول رحمہ اللہ کے بارے میں فرمایا:

وهو من كبار التابعين — اور وہ اکابر تابعین میں سے تھے۔

(التمهيد:۱۷-۱۲۲)

امام بدرالدین عینی حنفی رحمہ اللہ نے مکحول کی ایک مرسل روایت کے بارے میں لکھا ہے:

اسناده صحيح وهو مرسل والمرسل حجة عندنا — اس کی سند صحیح ہے اور یہ مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔

(عمدة القاری :۱۱-۳۰۲-حدیث:۲۱۸۹)

ابن الملقن رحمہ اللہ نے مکحول رحمہ اللہ کی بیان کردہ حدیث کے بارے میں کہا:

هذا الحديث جيد — یہ حدیث جید ہے۔

(البدر المنير:۳-۵۴۷)

امام نووی رحمہ اللہ نے تو ان کی توثیق پر اتفاق (اجماع) نقل کیا ہے:

واتفقو على توثيقه — اور ان کی توثیق پر اتفاق ہے۔

(تهذيب الاسماء واللغات:۲-۱۱۴)

طوالت کے خوف سے اس قدر کلمات توثیق وتعدیل پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ مذکورہ بالا محدثین کے علاوہ ابو سعید ابن یونس المصری (ت:۳۴۷ھ) سلیمان بن موسیٰ القرشی الاشدق، حافظ ابن جارود، سعید بن عبدالعزیز التنوخی، امام ابو حاتم الرازی، امام بن شہاب الزہری، حافظ ابن کثیر، حافظ ابو نعیم اصبہانی، امام بیہقی، امام محمد بن عبداللہ بن عمار الموصلی، ابن ناصر الدین دمشقی، امام خطابی، ضیاء مقدسی، حسین بن مسعود بغوی، ابن مندہ، ابن جریر الطبری اور احمد بن ابی بکر البوصیری جیسے جلیل القدر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ مکحول رحمہ اللہ کی توثیق کے حوالے سے اگر کوئی خلش اب بھی رہ گئی ہو تو ان کی توثیق وتعدیل کو کتب جرح وتعدیل میں اچھی طرح مطالعہ فرمالیں۔

معروف دیوبندی عالم مولانا نعیم الدین نے اپنی تالیف ''شب برأت کی فضیلت'' کے ایک مقام پر حاشیہ میں مکحول شامی رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا:

''حضرت مکحول شامی رحمہ اللہ اپنے وقت کے بہت بڑے حافظ الحدیث، فقیہ اور مجتہد تھے، بڑے بڑے علماء آپ کی جلالتِ علمی کے معترف تھے، آپ نے حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہند داری، حضرت واثلہ بن اسقع، حضرت ابو امامہ، حضرت عبدالرحمٰن بن غنم، حضرت ابو جندل بن سہیل رضی اللہ عنہم سے براہ راست احادیث کی سماعت کی ہے۔ آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء شامل ہیں ۱۱۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی ہے۔

(شب برأت کی فضیلت:۴۶)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مکحول شامی رحمہ اللہ نے کم از کم چھ صحابہ سے براہِ راست احادیث کی سماعت کی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ابن حبان اور ابن حجر نے ان کے بارے میں جو کثیر الارسال ہونے کی بات کی ہے وہ ان کے ثقہ ہونے کے بعد ان کی ثقاہت کو مجروح نہیں کرتی۔ زیادہ سے زیادہ اس سے ان کی بیان کردہ اس روایت کو ضعیف کہا جا سکتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایک محقق جب ایک راوی پر جرح نقل کرتا ہے تو اس پر دیگر محدثین کی طرف سے کی جانے والی تعدیل کا ذکر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ موصوف مردود اور شاذ جرح پر انحصار کر کے راویان حدیث کے بارے میں رائے قائم کر لیتے ہیں اور کثیر محدثین کی طرف سے ان کی توثیق و تعدیل کی پرواہ نہیں کرتے۔ یہ رویہ عدل و انصاف، دیانت اور ثقاہت سے کوسوں دور ہے۔

تیسری روایت پر جرح

اب موصوف کی طرف سے تیسری روایت پر کی جانے والی جرح پر بات کرتے ہیں جو کہ ضمرہ بن حبیب سے مروی ہے۔ وہ تابعی ہیں۔ اس پر ان کا پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ انہوں نے یہ روایت کسی صحابی کے واسطے کے بغیر بیان کی ہے بالفاظ دیگر یہ مرسل ہے۔ انہوں نے اس روایت کی سند کے ایک راوی ابو المغیرہ عبد القدوس بن الحجاج الخولانی کے بارے میں لکھا ہے کہ ابن حبان کی رائے یہ ہے کہ

وہ حدیثیں گھڑ کر ثقہ راویوں کے ذمے لگا دیتا ہے لیکن موصوف نے کوئی حوالہ نقل نہیں کیا۔ چنانچہ ہم نے اپنے طور پر ابن حبان کی ان دو کتب کو جو جرح وتعدیل کے حوالے سے معروف ہیں بنظر غائر دیکھا اور یہ پایا کہ وہ اپنی ''کتاب الثقات'' میں مذکورہ راوی کا تذکرہ کرتے ہیں اور بہت سے محدثین نے بھی یہ لکھا ہے کہ ابن حبان نے اپنی ''کتاب الثقات'' میں ان کا ذکر کیا ہے، اس کے باوجود ہم نے از راہ احتیاط ان کی دوسری کتاب ''کتاب المجروحین'' کو بھی دیکھا کہ شاید انہوں نے ان پر یہ جرح کہیں نقل کی ہو لیکن ابن حبان کے حوالے سے ایسی کوئی بات ہمارے سامنے نہ آسکی بلکہ ہم نے بہت سی دیگر کتب جو کہ جرح وتعدیل کے فن سے متعلق ہیں ان کو بھی دیکھا لیکن ہمیں ان میں مذکورہ راوی پر کسی بھی محدث کی طرف سے جرح کا ایک جملہ بھی نظر نہیں آیا بلکہ تقریباً سبھی کی طرف سے ان کی تعدیل وتوثیق ہی نظر آئی جن کتب کو ہم نے دیکھا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''تہذیب الکمال فی اسماء الرجال ۲۔ تہذیب التہذیب

۳۔ کتاب الثقات ۴۔ الجرح والتعدیل ۵۔ میزان الاعتدال

۶۔ تقریب التہذیب ۷۔ الکشف الحثیث ۸۔ نہایت السول

۹۔ السابق واللاحق ۱۰۔ کتاب الحفاظ ۱۱۔ لسان المیزان

اب ہم مذکورہ راوی کی تعدیل وتوثیق پر بات کرتے ہیں۔

امام ابن ابی حاتم نے انہیں صدوق کہا اور ان کے بارے میں لکھا:

يكتب حديثه

ان کی حدیث لکھی جاتی تھی۔

(الجرح والتعديل :۱، ۷، ۷۲)

امام ابن حجر نے ان کے حوالے سے لکھا ہے:

قال ابوحاتم : كان صدوقاً، وقال العجلي والدارقطني : ثقة وقال النسائي : ليس به بأس، وذكره ابن حبان في الثقات۔ قال البخاري : مات سنة اثنتي عشر ومأتين وصلى عليه احمد بن حنبل

(تهذيب التهذيب:۳۔۴۸۱۔رقم:۴۷۴۵)

ابوحاتم نے کہا کہ وہ سچے تھے۔ عجلی اور دارقطنی نے ان کو ثقہ کہا اور امام نسائی نے کہا کہ ان میں کوئی حرج نہیں اور ابن حبان نے اپنی ''الثقات'' میں ان کا ذکر کیا۔ امام بخاری نے کہا کہ ان کا وصال 212ھ میں ہوا اور امام احمد بن حنبل نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

خود امام ابن حجر نے بھی انہیں ثقہ کہا:

ثقة

ثقہ ہیں۔

(تقريب التهذيب:۱۔۴۷۷۔رقم:۴۶۴۵)

امام ذہبی نے لکھا ہے:

وثقه العجلي والدارقطني وغيرهما واخطا في ايداعه كتاب الضعفاء بعض الجهلة وقال ابو حاتم صدوق يكتب حديثه، وقال النسائي: ليس به بأس (ميزان الاعتدال:۴_۳۸۴_رقم:۵۱۶۲)

عجلی اور دارقطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہےاور بعض جہلاء نے انہیں ضعیف حدیث لکھنے والوں میں شامل کرنے کی خطا کی ہے۔ابوحاتم نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ سچے ہیں اوران کی حدیث لکھی جاتی ہے ۔امام نسائی نے کہا کہ ان پرکوئی اعتراض نہیں۔

امام ذہبی نے ان کے بارے میں مزید لکھا:

وكان من الثقات العلماء، قال بن زنجويه: ما رأيت اخشع من ابي المغيرة۔ قال البخاري: مات بحمص سنة اثنتي ومائتين وصلى عليه احمد بن حنبل (تذكرة الحفاظ:ا_۲۸۲)

وہ ثقہ علماء میں سے تھے اور ابن زنجویہ نے کہا کہ میں نے ابوالمغیرہ سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ امام بخاری نے کہا کہ ان کا وصال 212ھ میں حمص میں ہوااوران کی نماز جنازہ امام احمد بن حنبل نے پڑھائی۔

نهاية السول، میں بھی مذکورہ راوی کے بارے میں تعدیل وتوثیق من وعن نقل کی گئی ہے۔

اصل معاملہ کیا ہے؟

موصوف نے تو مذکورہ راوی پر ابن حبان کی جرح بلا حوالہ نقل کردی تھی لیکن ہماری جستجو بالآخر ہمیں اس مقام پر لے آئی جہاں سے غالباً انہوں نے یہ جرح نقل کی تھی۔ اگر وہ اس مقام کو بھی غور سے دیکھتے تو انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ جرح اصلاً ابن جوزی کی ہے لیکن تائیداً انہوں نے ابن حبان کا قول بھی نقل کیا ہے۔ مزید برآں انہیں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ جرح نقل کرنے سے پہلے مذکورہ راوی کی جید محدثین نے تعدیل وتوثیق بھی کی ہے۔ اب ہم اصل بات سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔ ہم نے یہ جرح ''الکشف الحثیث'' میں دیکھی ہم یہاں قارئین کی سہولت کے لیے پوری عبارت جرح وتعدیل نقل کر دیتے ہیں:

وثقه العجلی والدارقطنی وغیرهما واخطا فی ایداعه کتاب الضعفاء بعض الجهلة وقال ابو حاتم صدوق یکتب حدیثه، وقال س: لیس به بأس ثم ارخ الذهبی وفاته انتهی کلام المیزان۔

عجلی اور دار قطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے اور بعض جہلاء نے انہیں ''کتاب الضعفاء'' میں شامل کر کے خطا کی ہے۔ ابو حاتم نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ سچے ہیں اور ان کی حدیث لکھی جاتی ہے۔ امام نسائی نے کہا کہ ان پر کوئی حرج نہیں۔

وقد ذكره ابن الجوزي في موضوعاته في ذكر ما يكون بعد المأتين في سند حديث ثم قال: حديث موضوع لايصح قال ابن حبان: وعبد القدوس يضع الحديث على الثقات
(الكشف الحثيث:٢-١٧٢-رقم:٤٥٥)

پھر ذہبی نے ان کی وفات کی تاریخ میزان الکلام میں لکھی ۔ اور ابن جوزی نے اپنی موضوعات میں دو سو کے بعد والی حدیث کے تحت اس کا ذکر کیا۔ پھر کہا: حدیث موضوع ہے صحیح نہیں ہے ابن حبان نے کہا کہ عبدالقدوس ثقات پر حدیث گھڑتے ہیں۔

آپ نے ابن جوزی کی جرح ملاحظہ کی جس سے انہوں نے مذکورہ راوی کو مجروح کیا لیکن یہ ان کا تسامح تھا جو کتاب مرتب کرتے وقت ہوگیا۔ دراصل یہ جرح اسی کتاب میں ان سے قبل ذکر کیے گئے راوی عبدالقدوس بن حبیب الکلائی الشامی کے بارے میں تھی جس کا تکرار غلطی سے مذکورہ راوی کی تعدیل کے بعد بھی ہوگیا۔ اسی کتاب میں عبدالقدوس بن حبیب کے بارے میں امام نووی اور دیگر محدثین کی جرح نقل کرنے کے بعد واضح طور پر یہ لکھا گیا ہے:

ونقل ابن الجوزي في الموضوعات عن ابن حبان انه كان يضع الحديث (الكشف الحثيث:١٧١)

اور ابن جوزی نے اپنی موضوعات میں ابن حبان سے نقل کیا کہ یہ حدیث گھڑنے والے ہیں۔

اور یہی بات کتاب کے محقق صبحی السامرائی نے حاشیہ میں بھی نقل کی ہے:

ذکر ابن حبان ذلك في ترجمة عبد القدوس بن حبيب الكلاعي الذي تقدمت ترجمة۔ وقال الحافظ ابن حجر : ثقة	ابن حبان نے اس سے پہلے عبد القدوس بن حبیب الکلاعی کے ترجمہ میں ذکر کیا۔اور ابن حجر نے تقریب التہذیب میں ثقہ کہا۔

(تقريب التهذيب:ج:1ص515)

اس وضاحت کے بعد ہم موصوف سے یہ سوال کرنے میں تو حق بجانب ہیں کہ کسی حدیث کی سند پر ایسا غیر ذمہ دارانہ رویہ کیا کسی محقق کو زیب دیتا ہے؟

چنانچہ اب اس مرسل روایت کی سند کے بارے میں جو شبہ موصوف کی طرف سے وارد کیا گیا تھا وہ بتمام وکمال رفع ہو گیا۔

یہ روایت امام شعبی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے

موصوف نے تو مذکورہ بالا تین سندوں سے اس روایت کا ذکر کیا۔لیکن یہی روایت امام شعبی سے بھی مروی ہے جسے امام محب الدین طبری نے اپنی تالیف ''الرياض النضرة'' میں نقل کیا ہے:

وعن الشعبي : ان رجلاً من المنافقين ويهودياً اختصما فقال اليهودي: ننطلق الى محمد بن عبد الله، وقال المنافق :	امام شعبی سے روایت ہے کہ ایک منافق اور ایک یہودی کا جھگڑا ہو گیا، یہودی نے کہا ہم محمد بن عبداللہ (ﷺ) کے پاس چلتے ہیں۔

الی کعب بن اشرف فابی الیھودی واتی النبی ﷺ فقضی للیھودی، فلما خرج قال المنافق ننطلق الی عمر بن الخطاب وفاقبلا الیه فقصا علیه القصة فقال: رویداً حتی اخرج الیکما، فدخل البیت واشتمل علی السیف ثم خرج وضرب عنق المنافق وقال: ھکذا اقضی بین من لم یرض بقضاء النبی ﷺ فنزل جبریل فقال: ان عمر فرق بین الحق والباطل فسمی الفاروق خرجه الواحدی ابو الفرج

(الریاض النضرة فی مناقب العشرة:۲۔۲۳۵)

منافق کہنے لگا کہ کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں لیکن یہودی نہ مانا اور وہ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہو گیا سو آپ ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا، پھر جب وہ وہاں سے باہر آیا تو منافق کہنے لگا ہم عمر بن خطابؓ کے پاس چلتے ہیں دونوں آپ کے پاس حاضر ہوئے۔ اور ان کو اپنی ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ تو آپؓ نے فرمایا: ٹھہرو میں اندر سے ہو کر تمہارے پاس آتا ہوں سو آپ گھر میں داخل ہو کر تلوار لے کر باہر آئے اور منافق کی گردن اڑا دی۔ اور فرمایا: جو نبی اکرم ﷺ کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتا میں اس کا یہی فیصلہ کرتا ہوں، پھر سیدنا جبریل علیہ السلام اُترے اور کہا کہ عمر نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا، پھر آپ کا نام فاروق رکھ دیا گیا امام واحدی اور ابو الفرج نے اس کو تخریج کیا ہے۔

امام شعبی کی مراسیل حجت ہیں

اور امام شعبی سے مروی مراسیل کو درجہ قبولیت حاصل ہے۔ امام عبدالرحمٰن سخاوی مرسل کے بارے میں بطور خاتمہ لکھتے ہیں:

المرسل مراتب اعلاها ما ارسله صحابی ثبت سماعه، ثم صحابی له رواية فقط، ولم يثبت سماعه، ثم المخضرم، ثم المتقن كسعيد بن المسيب ويليها من كان يتحرى فی شيوخه كالشعبی ومجاهد، ودونها مراسيل من كان يأخذ عن كل احد كالحسن

(فتح المغیث:۱۴۸)

حدیث مرسل کے کئی مراتب ہیں سب سے اعلیٰ مرتبہ وہ ہے جس کو ایسا صحابی مرسلاً بیان کرے جس کا سماع ثابت ہو پھر وہ جن کی فقط روایت ہو اور سماع ثابت نہ ہو۔ پھر مخضرم، پھر متقن جیسے سعید بن میتب اور اسی کے ساتھ متصل ہیں وہ محدثین جو اپنے شیوخ میں خوب تحری کرتے ہیں۔ جیسے امام شعبی، مجاہد اور اس سے کم درجہ پر ان محدثین کی مراسیل ہیں جو ہر ایک سے حدیث اخذ کرتے تھے جیسے حضرت حسن (بصری)۔

بلکہ امام شعبی کے بارے میں تمام ائمہ اور محدثین کا اجماع ہے کہ ان سے مروی مراسیل صحیح ہیں اور انہیں قبول کیا جائے گا بالفاظ دیگر ان کی ثقاہت پر کسی بھی محدث نے کلام نہیں کیا، ان کے ساتھ حضرت سعید بن المسیب، حضرت ابراہیم النخعی اور حسن بصری رحمہم اللہ کو بھی شامل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وارسال الائمة من التابعين (كالحسن) وسعيد(بن المسيب و)عامر (الشعبي) وابراهيم (النخعي وغيرهم ، وكان ذلك) اي التحديث على سبيل الارسال (معروفاً) بينهم (مستمراً) من قرن الصحابة الى التابعين (بلا نكير)من احد من الائمة (فكان) ذلك (اجماعاً) على قبول المراسيل، ولايذهب عليك السكوت عن ارسال الصحابة، فان قبوله متفق عليه لايصلح حجتي المتنازع فيه، ولعل مقصوده ان الارسال صنع جرى من وقت الصحابة الى القرون التى بعدها وقبل الكل ولم يتركوا المرسل

(فواتح الرحموت:۲_۲۲۵)

اور ائمہ تابعین جیسے حسن (بصری) سعید (بن المسیب) عامر (الشعبی) اور ابراہیم (النخعی) ودیگر مرسل طریقہ پر حدیث بیان کرنا ان کے ہاں معروف تھا اور صحابہ سے لے کر تابعین تک کسی امام کے انکار کے بغیر جاری وساری تھا۔ سو مراسیل کے قبول ہونے پر یہ اجماع ہوگیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ارسال کے بارے میں سکوت تجھ پر (مخفی نہ رہے) کیونکہ ارسال صحابہ کی قبولیت متفق علیہ ہے۔وہ متنازع فیہ میں استدلال کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی ۔شاید مصنف کا مقصود یہ ہو کہ ارسال صحابہ کے وقت سے لےکر بعد کے زمانہ تک جاری ہے اور اسے تمام نے قبول کیا اور کسی نے مرسل کو ترک نہیں کیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے جو کچھ حضرت سعید بن المسیب رحمہ

اللہ کی مراسیل کی حجیت کے بارے میں منقول ہے، اس پر بعض شوافع محدثین نے جرح کی ہے اور اس کی معنویت کے حوالے سے دو مختلف معانی بیان کیے ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں

اشتھر عند فقھاء اصحابنا ان مرسل سعید حجة عند الشافعی حتی ان کثیراً منھم لایعرفون غیر ذلك ولیس الامر علی ذلك ثم بینه بما ذکر معناہ فی شرح المھذب فانه قال فیه عقب نقله عن الشافعی فی المختصر مما رواہ عنه الربیع ایضاً ارسال ابن المسیب عندنا حسن ما نصه اختلف اصحابنا المتقدمون فی معناہ علی وجھین، حکاھما الشیخ ابو اسحاق فی اللمع والخطیب فی کتابیه الفقیه والمتفقه والکفایة وآخرون۔ احدھما انھا حجة عندہ بخلاف غیرھا من

ہمارے فقہاء اصحاب کے نزدیک یہ بات مشتہر ہے کہ حضرت سعید کی مرسل امام شافعی کے نزدیک حجت ہے حتی کہ ان اصحاب میں سے بہت سارے اس کے علاوہ کو پہچانتے ہی نہیں ہیں حالانکہ معاملہ اس طریقہ پر نہیں۔ پھر انہوں نے ذکر کردہ گفتگو کا مفہوم شرح مہذب میں بیان کیا۔ چنانچہ انہوں نے ''المختصر'' میں امام شافعی سے نقل کرنے کے بعد ان سے ربیع نے بھی روایت کیا، فرمایا: ہمارے نزدیک ابن مسیب کا ارسال حسن ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے: ہمارے متقدمین اصحاب کا اس معنی میں دو وجوہ پر اختلاف ہے ان دونوں وجوہ کو شیخ ابو اسحاق نے ''اللمع'' میں اور خطیب بغدادی نے اپنی دونوں کتابوں ''الفقیہ والمتفقہ'' اور ''الکفایہ'' میں اور دیگر لوگوں نے حکایت کیا۔

المراسیل۔ قالوا: لانها فتشت فوجدت مسندة۔ ثانیهما انها لیست بحجة عنده بل هی کغیرها علی ما ذکرناه قالوا وانما رجح الشافعی لمرسله والترجیح بالمرسل جائز

(فتح المغیث: ۱۴۰)

ان دونوں میں سے ایک فقط مراسیل ابن میتب امام شافعی کے نزدیک حجت ہیں باقی نہیں انہوں نے کہا، یہ حجت اس لئے ہیں کیونکہ انہیں خوب جانچ پڑتال کے بعد مسند پایا گیا۔ دوسری وجہ یہ باقی مراسیل کی طرح امام شافعی کے نزدیک حجت نہیں ہیں جیسا کہ ہم نے اس کا ذکر کر دیا ہے انہوں نے کہا کہ امام شافعی نے مرسل کو ترجیح دی ہے اور ترجیح بالمرسل جائز ہے۔

خطیب بغدادی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الفقیه والمتفقه'' میں فرماتے ہیں:

والصواب الثانی واما الاول فلیس بشیء و کذا قال فی الکفایة ان الثانی هو الصحیح لان فی مراسیل سعید مالم یوجد بحال من وجه یصح

(فتح المغیث: ۱۴۰)

درست دوسرا قول ہے جہاں تک پہلا قول ہے تو وہ کچھ بھی نہیں ہے اور اسی طرح خطیب نے ''الکفایہ'' میں کہا کہ دوسرا قول ہی درست ہے کیونکہ سعید کی مراسیل میں بھی ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو ہر حال میں درست نہیں ہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقد ذكرنا لابن المسيب مراسيل لم يقبلها الشافعي حيث لم ينضم اليها مايؤكدها قال وزيادة ابن المسيب في هذا على غيره انه اصح التابعين ارسالاً فيما زعم الحفاظ قال: واما قول القفال المروزي في اول كتابه شرح التلخيص- قال الشافعي في الرهن الصغير : مرسل عندنا حجة، فهو محمول على التفصيل الذي قدمناه عن البيهقي والخطيب والمحققين

(فتح المغيث : ۱۴۰)

اور ہم نے ابن میتب کی ایسی مراسیل کا ذکر کیا ہے جنہیں امام شافعی نے اس لئے قبول نہیں کیا کیونکہ ان کے ساتھ ان کو تقویت دینے والی چیز منضم نہیں تھی۔ نیز کہا کہ اس سلسلہ میں ابن میتب کا اپنے غیر پر اس لحاظ سے اضافہ ہوسکتا ہے کہ وہ حفاظ کے گمان کے مطابق تابعین میں سب سے زیادہ صحیح ارسال کرنے والے ہیں۔ نیز کہا جہاں تک شیخ قفال مروزی کا ان کی کتاب ''التلخیص'' کے اول میں قول کا تعلق ہے کہ امام شافعی نے ''الرہن الصغیر'' میں کہا، ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے تو یہ اسی تفصیل پر محمول ہے جسے ہم نے امام بیہقی، خطیب اور دیگر محققین کے حوالے سے گذشتہ بحث میں بیان کر دیا ہے۔

حافظ صلاح الدین کا مذکورہ محدثین سے اختلاف

لیکن حافظ صلاح الدین ابو سعید بن خلیل بن کیکلدی العلائی (ت: ۷۶۱ھ) نے مذکورہ شوافع محدثین کے نکتۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا بلکہ امام شافعی کے اقوال کی روشنی میں اس معنٰی و مفہوم کا رد کیا، وہ کہتے ہیں کہ چونکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے مروی مراسیل کا استثناء کیا ہے اس لیے اگر مراسیل کو دیگر سہاروں پر رکھ کر رائے قائم کرنا مقصود ہوتا تو وہ حضرت سعید بن المسیب کی مراسیل کا استثناء نہ کرتے اور صاف ظاہر ہے کہ یہ استثناء اسی بنیاد پر ہے کہ حضرت سعید بن المسیب خود ثقہ ہیں اور ثقہ سے ارسال کرتے ہیں۔ لہذا یہ وصف کبار تابعین میں سے جس راوی میں بھی موجود ہوگا اس کی مراسیل مقبول ہونگیں۔

وقد قال في مختصر المزني: ارسال سعيد بن المسيب عندنا حسن وقد تاول الخطيب وغيره من اصحابنا ذلك انه اراد اذا اعتضدت بشيء مما ذكره من هذه الوجوه لا انها تقبل بانفرادها لانه وجد لسعيد بن المسيب	اور "مختصر المزنی" میں کہا، ہمارے نزدیک سعید بن میتب کا ارسال حسن ہے اور خطیب بغدادی اور دیگر ہمارے اصحاب شوافع نے اس قول کی تاویل یوں کی ہے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ جب اسے ذکر کردہ وجوہ میں سے کسی وجہ سے تقویت دی جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ انفرادی طور پر بھی مقبول ہے۔

عدة مراسیل لم تعرف مسندة ولم یقل بها الشافعی۔ وكذلك قال البیهقی ایضاً فی بعض كتبه۔ واختاره النووی ایضاً وفی كل ذلك نظر لما تقدم من قول الامام الشافعی رحمه الله: ولیس المنقطع بشیء ما عدا منقطع سعید بن المسیب فان هذا ظاهر فی استثنائه مراسیله من بین جمیع المراسیل، وانها تقبل بمجردها، ویعتضد ذلك بنصه الذی نقله المزنی عنه فی المختصر ایضاً، ولو كان اراد بذلك ما اذا اعتضدت بشیء من هذه الوجوه لم یكن الاستثناء به مراسیل سعید وحده فائدة، بل مراسیل غیره

کیونکہ سعید بن میتب کی متعدد مراسیل ایسی ہیں جن کا مسند ہونا معروف نہیں ہے اور نہ ہی امام شافعی مراسیل کو قبول کرنے کے قائل ہیں۔ اور امام بیہقی نے بھی اپنی بعض کتب میں اسی طرح فرمایا ہے۔ امام نووی نے بھی اس کو اختیار فرمایا ہے۔ امام شافعی کے گزشتہ قول ''کہ حدیث منقطع کی کوئی حیثیت نہیں ہے سوائے سعید بن میتب کی منقطع حدیث کے'' کی وجہ سے اس تمام میں نظر ہے کیونکہ یہ قول تمام مراسیل کے مابین سے سعید بن میتب کی مراسیل کے استثناء میں ظاہر ہے اور یہ بھی کہ سعید بن میتب کی مراسیل مجرداً (بغیر اعتضاد کے) مقبول ہیں اور اس قول کو اس نص سے تقویت دی جائے گی جس کو مزنی نے ہی آپ سے ''مختصر'' میں نقل کیا۔

اور اگر اس سے مراد یہ ہو کہ جب ان وجوہ میں سے کسی وجہ کے ساتھ تقویت دی جائے تو پھر اس سے فقط سعید بن میتب کی مراسیل کے استثناء کا کوئی فائدہ نہیں رہے گا بلکہ سعید بن میتب کے علاوہ کی مراسیل بھی اسی طرح ہیں جب انہیں تقویت دی جائے اور سعید بن میتب کی مراسیل کے بارے میں امام شافعی کے علاوہ دیگر علماء نے بھی ایسے ہی کہا ہے۔

كذلك اذا اعتضدت، وكذلك قال ايضاً غير الشافعي في مراسيل ابن المسيب (جامع التحصيل في احكام مراسيل :۴۶-۴۷)

اگر بر سبیل تنزل یہ مان بھی لیا جائے کہ شافعی محدثین کی طرف سے کیا گیا اعتراض امام شعبی کی حد تک رفع نہیں ہوتا تو پھر بھی یہ بات تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ اس مسئلہ پر کم از کم ائمہ ثلاثہ تو متفق ہیں۔ رہ گیا شوافع کا مسئلہ تو وہ اس اُصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر متعدد مرسل روایات مختلف سندوں سے مختلف تابعین سے مروی ہوں اور ان کا معنیٰ ومفہوم ایک ہی ہو تو یہ مراسیل ایک دوسرے سے قوت پا کر قابل قبول ہو جاتی ہیں۔ خود ابن حجر نے ''فتح الباری'' میں ایسی ہی بعض مراسیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وھذہ المراسیل تقوی بعضھا ببعض اور یہ مراسیل ہیں جو ایک دوسری کو مضبوط بنادیتی ہیں۔ (فتح الباری: ۱۲۔۲۶۳)

اگر ہمارے پیش نظر مراسیل پر اس اُصول کا اطلاق بھی کیا جائے تو بھی شوافع کے نزدیک بھی یہ اعتراض رفع ہوجاتا ہے کیونکہ یہ مرسل روایات بھی مختلف تابعین سے مختلف سندوں کے ساتھ مروی ہیں اوران کا معنیٰ ومفہوم بھی ایک ہی ہے لہذا یہ ایک دوسرے سے تقویت پاکر قابل قبول ہوجاتی ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ امام شعبی کی مراسیل کے مقبول اور حجت ہونے پر جواجماع کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ قائم ہے اوراس پر شافعی محدثین کا اعتراض بھی رفع ہوجاتا ہے۔

موصوف کی طرف سے درایتاً اعتراضات

اس کے بعد موصوف نے مذکورہ روایتوں پر از روئے درایت بھی کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں جن کا ذکر ہم کررہے ہیں:

پہلا اعتراض: اس واقعہ کو منطقی طور پر کتب تاریخ وسیرت میں نمایاں طور پر مذکور ہونا چاہیے تھا جبکہ یہاں صورت حال یہ ہے کہ تاریخ اور تفسیر کی معروف کتابوں میں اس کا کہیں ذکر تک نہیں۔

دوسرا اعتراض: امام ابن جریر طبری کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر آیت کے شان نزول کے متعلق تمام اقوال وروایات کا احاطہ کرتے ہیں لیکن انہوں نے اس واقعہ کی طرف

ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں کیا۔

تیسرا اعتراض: حافظ ابن کثیر نے بھی اس کو "غریباً جداً" کہا ہے۔ اُصول حدیث کی رو سے ایسے معروف واقعات کی روایت میں خبر واحد معتبر نہیں ہوتی۔

چوتھا اعتراض: اس واقعہ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسی محتاط سمجھدار اور حدود اللہ کی پابند شخصیت کو ایک مغلوب الغضب انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ دین کے معاملے میں نہایت باحمیت اور غیرت مند تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے ایسے کئی مواقع پر حد سے تجاوز نہیں کیا بلکہ کسی بھی اقدام کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت طلب کی۔ چنانچہ یہ روایت واضح طور پر ان دین دشمن عناصر کی وضع کردہ معلوم ہوتی ہے جس کا مقصد اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شخصیات کو مسخ کرنا اور انہیں داغدار شکل میں پیش کرنا ہے۔

اب ہم ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں:۔

پہلے اعتراض کا جواب

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ یہ واقعہ تقریباً تفسیر کی کافی کتابوں میں مذکور ہے۔ ہم نے متعدد متقدمین و متاخرین کی تفاسیر کا ذکر پہلے کر دیا ہے لہذا ان کا یہ کہنا کہ یہ واقعہ کسی تفسیر کی معروف اور قدیم کتاب میں مذکور نہیں، اس پر اظہار افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کتب تاریخ میں اس واقعہ کے مذکور ہونے کا تعلق ہے تو

جب ایک واقعہ تواتر کے ساتھ کتب تفاسیر میں آیا ہو اور کتب احادیث میں بھی اس کا ذکر موجود ہو تو کیا بطور اُصول اس کا کتب تواریخ میں موجود ہونا بھی ضروری ہے؟ یہ تو دیکھا جاتا ہے کہ کوئی تاریخی روایت اگر کتب احادیث اور تفاسیر میں نہیں ملتی تو اس پر شک وارد کیا جائے لیکن یہ انوکھا اُصول ہے کہ کسی روایت کے تاریخی کتب میں نہ ملنے کو اس روایت کے غلط ہونے کا سبب قرار دیا جائے۔

کتب مناقب وتاریخ میں اس واقعہ کا ذکر

پھر بھی ہم بعض کتب مناقب وتاریخ کا ذکر کر دیتے ہیں جن میں یہ واقعہ منقول ہے۔ ملاحظہ ہو:

امام یوسف بن حاطی (ت: ۸۳۰ھ) کی معروف تالیف "محض الصواب فی فضائل امیر المؤمنین عمر بن خطاب" (جلد اول؛ صفحہ: ۱۷۵-۱۷۶) پر یہ واقعہ منقول ہے۔

اسی طرح معروف فقیہ حافظ السید احمد بن زینی دحلان کی "الفتح المبین فی فضائل الخلفاء الراشدین واھل بیت الطاهرین" کے (صفحہ: ۱۲۲-۱۲۳) پر بھی یہ واقعہ موجود ہے۔

امام طبری نے اپنی معروف کتاب "الریاض النضرة فی مناقب العشرة" (جلد دوم؛ صفحہ، ۲۳۵) پر امام شعبی سے مروی یہی روایت نقل کی ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب

موصوف نے نہ جانے کس مغالطے کی بنیاد پر امام طبری سے یہ بات منسوب کر دی ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کی طرف ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں کیا حالانکہ انہوں نے سورۃ النساء کی آیت نمبر 60 کے تحت ان تمام روایات کا ابتدائی حصہ نقل کیا ہے جن میں اس واقعہ کا ذکر ہے انہوں نے کم وبیش ایک درجن سے زائد ایسی روایات جمع کی ہیں جن میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے البتہ انہوں نے ان روایات کا صرف ابتدائی حصہ نقل کیا ہے جس میں منافق کے قتل والا حصہ موجود نہیں ہے۔ جامع البیان کا یہ مقام دیکھا جائے تو کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ موصوف یہ کہہ دیں کہ یہ واقعہ چونکہ امام طبری نے اختصاراً بیان کیا ہے یا اس کی تفصیل بیان نہیں کی تو شاید اس واقعہ کا وہ حصہ جو منافق کے قتل سے متعلق ہے اس پر امام طبری کو کوئی اعتراض تھا اس لیے اسے بیان کرنے سے گریز کیا۔ چنانچہ ہم اہل علم کی آراء پیش کر دیتے ہیں جن سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ امام طبری کی نقل کردہ روایات میں وہی واقعہ مذکور ہے، جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا منافق کو قتل کرنا ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ انہوں نے ان روایات کا صرف ابتدائی حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا۔

امام جمال الدین زیلعی کی تصریح

امام جمال الدین عبداللہ بن یوسف زیلعی اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

واما الطبری فانه اختصره ولم یذکر فیه قصة عمر بن ذکر صدر الحدیث فقط عن ابن عباس (تخریج الاحادیث والآثار:۱۔۳۳۰)	یعنی امام طبری نے اسے مختصراً بیان کیا اور اسی میں قصہ عمر رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ حدیث کا ابتدائی حصہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا۔

امام ابن حجر رحمہ اللہ (ت:۸۵۲ھ) کی مفصل وضاحت

امام ابن حجر عسقلانی نے "فتح الباری" میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت کو اگرچہ ضعیف کہا لیکن ساتھ ہی یہ لکھ دیا کہ یہ طریق مجاہد سے قوی ہو جاتی ہے اور یہ بھی لکھ دیا کہ اختلاف واقعہ نقصان نہیں دیتا کیونکہ تعدد کا امکان موجود ہے۔

پھر انہوں نے امام طبری کے حوالے سے یہ لکھا کہ انہوں نے اپنی تفسیر میں اسی واقعہ کو راجح قرار دیا ہے اور اپنی کتاب "تهذیب الآثار" میں انہوں نے بیان کیا کہ ان آیات کا سبب نزول یہی واقعہ ہے تا کہ تمام آیات کا نظم سبب واحد کے تحت آجائے اور ان کے درمیان کوئی ایسی شے نہ آجائے جو ان کے خلاف کا تقاضا

کرے۔حافظ ابن حجر کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

وجزم مجاهد والشعبی بان الایة انما نزلت فیه الایة التی قبلها وهی قوله تعالیٰ الم تر الی الذین یزعمون انهم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت الایة فروی اسحاق بن راهویه فی تفسیره باسنادصحیح عن الشعبی قال کان بین رجل من الیهود ورجل من المنافقین خصومة فدعاالیهودی المنافق الی النبی ﷺ لانه علم انه لایقبل الرشوة ودعا المنافق الیهودی الی حکامهم لانه علم انهم یاخذونها فانزل الله هذا الآیات الی قوله ویسلموا تسلیماً

حضرت مجاہد اور شعبی نے جزم کا اظہار کیا ہے کہ یہ آیت ان کے حق میں نازل ہوئی ہے جن کے حق میں پہلی آیتیں آئی ہیں اور یہ ارشاد گرامی ہے: "الم تر الی الذین یزعمون انهم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت الایة" امام اسحاق بن راہویہ نے اپنی تفسیر میں سند صحیح کے ساتھ امام شعبی سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی اور منافق کے درمیان جھگڑا ہوا یہودی نے منافق کو نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فیصلے کی دعوت دی اس لیے کہ وہ یہ جانتا تھا کہ آپ ﷺ رشوت نہیں لیتے۔منافق نے یہودی کو ان کے حکام کی طرف دعوت دی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ رشوت لیتے ہیں

واخرجه ابن حاتم من طريق ابن ابى نجيح عن مجاهد نحوه وروى الطبرى باسناد صحيح عن ابن عباس ان ابى حاكم اليهود يومئذ كان ابا برزة الاسلمى قبل ان يسلم ويصحب وروى باسناد آخر صحيح الى مجاهد انه كعب بن الاشرف وقد روى الكلبى فى تفسيره عن ابى صالح عن ابن عباس قال نزلت هذه الاية فى رجل المنافقين كان بينه وبين يهودى خصومة فقال اليهودى انطلق بنا الى محمد وقال المنافق بل نأتى كعب بن الاشرف فذكر القصة وفيه ان عمر قتل المنافق وان ذلك سبب نزول هذه الآيات

تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات "ویسلموا تسلیماً" تک نازل کیں۔ امام ابن ابی حاتم نے ابن ابی نجیح کی سند سے حضرت مجاہد سے اسی طرح نقل کیا۔ امام طبری نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ یہودی حاکم اس وقت ابو برزہ اسلمی تھے یہ ان کے اسلام لانے اور صحابی بننے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ حضرت مجاہد تک ایک اور صحیح سند سے کعب بن اشرف کا نام بھی ہے اور امام کلبی نے اپنی تفسیر میں ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ یہ آیت مبارکہ منافق اور اس یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جن میں جھگڑا ہوا۔ یہودی نے کہا کہ محمد ﷺ کے پاس چلو۔ منافق نے کہا: کہ بلکہ ہم کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں

وتسمية عمر الفاروق وهذا الاسناد وان كان ضعيفاً لكن تقوى بطريق مجاهد ولايضره الاختلاف لامكان التعدد وافاد الواحدي باسناد صحيح عن سعيد عن قتادة ان اسم الانصاري المذكور قيس ورجح الطبري في تفسيره وعزاه الى اهل التاويل في تهذيبه ان سبب نزولها هذه القصة ليتسق نظام الايات كلها في سبب واحد قال ولم يعرض بينها ما يقتضي خلاف ذلك

پھر انہوں نے واقعہ ذکر کیا اور اسی میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منافق کو قتل کر دیا اور یہی ان آیات کے نزول اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام ''فاروق'' کا سبب بنیں۔ یہ سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن حضرت مجاہد کے طریق سے اسے قوت حاصل ہو جاتی ہے اور تعدد کے امکان کی وجہ سے اختلاف مضر نہیں رہتا۔ امام واحدی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سعید اور انہوں نے قتادہ سے مذکور انصاری کا نام قیس ذکر کیا ہے۔ امام طبری نے اپنی تفسیر میں اسے ترجیح دی ہے اور اپنی کتاب ''تہذیب الآثار'' میں اہل تاویل کی طرف سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا سبب نزول یہی واقعہ ہے تاکہ تمام آیات کا ایک ہی سبب کے تحت نظم قائم رہے۔

ثم قال ولا مانع ان تكون	اور کہا کہ ان کے درمیان کوئی ایسی چیز نہ آجائے
قصة الزبير وخصمه وقعت	جو اس کے مخالف ہو پھر لکھا کہ اس سے کوئی مانع
في اثناء ذلك فيتناولها	نہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ان کے
عموم الاية۔ والله اعلم	مخالف کا واقعہ اس اثنا میں پیش آیا ہو تو اسے بھی
(فتح الباری:۵۔۲۹)	آیت کا عموم شامل ہے۔واللہ اعلم

امام ابن جحر رحمہ اللہ کی تہذیب الآثار کے حوالے سے توضیح

حافظ ابن حجر نے امام طبری کی "تہذیب الآثار" کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام طبری مسند زبیر بن عوام کے تحت حضرت زبیر کا پانی والا واقعہ ذکر کرتے ہیں اور کچھ اہل علم کی طرف سے اس مذکورہ واقعہ پر تیسرا اعتراض یوں بیان کرتے ہیں کہ اہل تاویل نے اس آیت یعنی (سورۃ النساء: آیت: ۶۰) کو اس واقعہ پر محمول کیا ہے کہ منافق اور یہودی کا جھگڑا ہوا۔ یہودی نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ کی طرف اور منافق نے کعب بن اشرف کی طرف رجوع کی دعوت دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں۔

اور اہل علم کہتے ہیں کہ ان اہل تاویل کا یہ قول صحت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ یہ دونوں کے ذکر کے سیاق میں ہے اور ان کے واقعات کے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں جو روایت کو ان کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف پھیر دے۔

اس کے بعد انہوں نے اس واقعہ پر متعدد روایات امام شعبی اور حضرت مجاہد سے نقل

والثالثة:ان اهل التاويل انما وجهوا تاويلٌ هذا الاية الى انه عنى بها المنافق الذى خاصم اليهودى الذى دعاه الى رسول الله صلى الله عليه وسلم دعاه المنافق الى كعب بن اشرف او الى الكاهن من جهينة اللذين انزل الله تبارك وتعالىٰ فيهما : الم تر الى الذين يزعمون انهم آمنوا بما انزل اليك وما انزل من قبلك يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد امروا ان يكفروا به (النساء:٦٠) قالوا: وقولهم ذلك اقرب الى الصحة لان ذلك فى سياق ذكرهما ولم يعترض من قصتهما شیء يوجب صرف الخبر عنهما الى غيرهما

تیسری دلیل ان کی یہ ہے کہ اہل تاویل نے اس آیت کی تاویل کرتے ہوئے مراد وہ منافق لیا ہے جسے یہودی نے رسول اللہ ﷺ کی طرف دعوت دی اور منافق نے کعب بن اشرف یا قبیلہ جہینہ کے کاہن کی طرف دعوت دی جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ نازل کیا: ''الم تر الی الذین یزعمون انهم آمنوا بما انزل الیك وما انزل من قبلك یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به (النساء:٦٠)'' اور ان کا یہ کہنا ہے کہ ان کا یہ قول صحت کے زیادہ قریب ہے کیونکہ یہ ان دونوں کے ذکر کے سیاق میں ہے اور ان دونوں کے واقعہ میں کوئی شے عارض نہیں ہوئی جو اس خبر کو ان دونوں کے غیر کی طرف پھیرے

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی ذاتی تحقیق

حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب ''العجاب'' میں سورۃ النساء کی ان آیات کے شان نزول کے بارے میں امام ابن ابی حاتم سے یہی واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں ان لوگوں کے قول کو تقویت حاصل ہے جو کہتے ہیں کہ یہ تمام آیات ان کے حق میں نازل کی گئیں جو مقدمہ (کعب بن اشرف یا کاہن) کے پاس لے جانا چاہتے تھے۔ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:

وفیہ تقویة لقول من قال: ان الایات کلھا انزلت فی حق المتخاصمین الی الکاھن کما تقدم ، وبھذا جزم الطبری وقواہ بان الزبیر لم یجزم بان الایة نزلت فی قصة بل اوردہ ظناً قلت : لکن تقدم فی حدیث ام سلمة الجزم بذلہ ویحتمل ان تکون قصة الزبیر وقعت فی اثناء ذلك فتنا ولھا عموم الایة واللہ اعلم

(العجاب فی بیان الاسباب: ج۲، صفحہ:۹۰۹)

اس میں ان کے قول کی تقویت ہے جو کہتے ہیں کہ یہ تمام آیات ان کے حق میں نازل ہوئیں جو کاہن کی طرف اپنا معاملہ لے کر گئے جیسا کہ پیچھے گزرا۔امام طبری نے اس پر جزم کیا اور اسے قوی قرار دیتے ہوئے کہا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بطور جزم یہ بیان نہیں کیا کہ یہ آیت ان کے واقعہ میں نازل کی گئی ہے بلکہ انہوں نے یہ بات بطور ظن کہی۔میرے نزدیک حضرت اُم سلمہ کی حدیث میں اس بارے میں جزم کا ذکر ہوا ہے ممکن ہے کہ یہ حضرت زبیر کا واقعہ اسی اثنا میں پیش آیا ہو تو عموم آیت اسے بھی شامل ہے۔ واللہ اعلم

ان تصریحات سے چند اُمور بخوبی واضح ہو گئے:

ا۔اس واقعہ کو امام طبری نے مختصراً سورۃ النساء کی آیت 60 کے سبب نزول کے طور پر بیان کیا ہے۔

۲۔اسی واقعہ کو سبب نزول کے طور پر امام طبری سمیت دیگر ائمہ یعنی امام ابن حجر، امام ابن ابی حاتم اور امام ذہبی وغیرہم ترجیح دیتے ہوئے صواب قرار دیتے ہیں۔

۳۔ابن حجر نے یہ تصریح بھی کر دی کہ طبری کی طرف سے مختصراً بیان کیے گئے اس واقعہ کا ہی حصہ یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منافق کو قتل کر دیا۔ ملاحظہ ہو:

وفیہ ان عمر قتل المنافق وان ذلك سبب نزول هذه الآيات والتسمية عمر الفاروق (فتح الباری:۵۔۲۹)	کہ اسی کا حصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منافق کو قتل کیا اور یہی ان آیات کے نزول کا سبب ہے اور اسی سبب سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام ”فاروق“ رکھا گیا۔

اسی بات کی تصریح امام زیلعی نے بھی کی ہے:

بل ذکر صدر الحدیث فقط عن ابن عباس (تخریج الاحادیث والآثار:ا۔۳۳۰)	بلکہ امام طبری نے اس حدیث کا فقط ابتدائی حصہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

۴۔حافظ ابن حجر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی سند کے بارے میں بھی یہ تصریح کر دی کہ اگرچہ اس میں ضعف ہے لیکن طریق مجاہد سے مروی سند سے اسے تقویت حاصل ہو جاتی ہے اور اس سے استدلال کرنا درست قرار پاتا ہے۔

۵۔انہی اہل علم کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سورۃ النساء کی آیت 60 اور 65 کا سبب نزول اگر اسی واقعہ کو قرار دیا جائے تو یہ نظم آیات کے زیادہ مناسب ہے۔

۶۔اہل علم نے یہ بھی تصریح کر دی کہ ہوسکتا ہے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ بھی درمیان میں ہو لہذا وہ بھی آیت کے عموم میں شامل ہے اور اصل سبب نزول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ والا یہی واقعہ ہے۔

اہل علم کی ان تصریحات کے بعد امام طبری کے حوالے سے موصوف کی طرف سے کیے گئے اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ موصوف نے نہایت عجلت میں غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اس واقعہ کو استنادی حیثیت کے اعتبار سے اور از روئے درایت بھی مجروح کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

تیسرے اعتراض کا جواب

امام ابن کثیر نے ابن لہیعۃ سے مروی اس روایت کو غریب جداً کہا ہے لیکن ضعیف جداً نہیں کہا، دونوں اصطلاحات میں بہت زیادہ فرق ہے۔ایک فن ہے جو

غریب الحدیث کے متعلق ہے اور دوسرا کسی حدیث کا غریب ہونا۔ امام ابن الصلاح فن غریب الحدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

وهو عبارة عما وقع فى متون الاحاديث من الفاظ الغامضة البعيدة من الفهم لقلة استعمالها هذا فن مهم يقبح جهله باهل الحديث خاصة ثم باهل العلم عامة والخوض فيه ليس بالهين
(مقدمه ابن الصلاح: صفحہ، ۳۵)

غریب الحدیث وہ فن ہے جس میں متون احادیث میں ایسے الفاظ سے بحث کی جاتی ہے جو نہایت مشکل اور فہم سے بعید ہوتے ہیں کیونکہ وہ قلیل الاستعمال ہوتے ہیں اور یہ اہم فن ہے محدثین کا اس سے جاہل رہنا خصوصاً اور دیگر اہل علم کا عموماً قبیح ترین فعل ہے مگر اس میں دخل دینا بھی آسان کام نہیں۔

اور امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

غريب الحديث هو ما وقع فى متن الحديث من لفظة غامضة بعيدة من الفهم لقلة استعمالها وهو فن مهم والخواص فيه صعب فليتحر خائضة الخ
(تقريب النواوى مع تدريب الراوى: صفحہ: ۳۷۸۔ طبع مصر)

غریب الحدیث اس کو کہتے ہیں کہ متن حدیث میں کوئی مشکل اور بعید از فہم لفظ واقع ہو کیونکہ اس کا استعمال کم ہوا ہے اور یہ اہم فن ہے اور اس میں خوض اور دخل دینا بہت مشکل ہے سو اس میں خوض کرنے والے کو محنت اور کوشش کرنی چاہیے۔

چونکہ یہ فن بڑا مشکل ہے اس پر عبور حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام مالک، امام عبدالرزاق، امام ابو یوسف وغیرھما نے اس فن میں دخل دینے سے منع کر دیا۔

غریب حدیث صحیح بھی ہو سکتی ہے

دوسری طرف وہ حدیث جس کے بارے میں لفظ غریب بولا جائے اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ وہ روایت صحت کے معیار سے گر گئی ہے یا ضعیف ہو گئی ہے، یہ ہرگز درست نہیں۔

محدثین کے نزدیک ہر غریب حدیث علی الاطلاق نہ تو صحیح ہوتی ہے اور نہ ہی ضعیف اور منکر۔

امام ابن الصلاح فرماتے ہیں:

ثم ان الغریب ینقسم الی صحیح کالافراد المخرجة فی الصحیح والی غیر صحیح وذلك ھو الغالب علی الغرائب	پھر غریب کی دو قسمیں ہیں ایک صحیح جیسے ان متفرد راویوں کی حدیثیں جن کی صحیح میں تخریج کی گئی ہے اور دوسری غیر صحیح اور غرائب پر یہی غالب ہے۔

(مقدمہ: ۲۴۴)

امام نووی نے بھی اسی تقسیم کا ذکر کیا ہے:

وينقسم الى صحيح وغيره وهو الغالب اھ — کہ غریب کی دو قسمیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غیر صحیح اور غالب یہی ہے۔

(تقریب النواوی:۳۷۶)

اس سے پتہ چلا کہ غریب احادیث صحیح بھی ہوتی ہیں، مثلاً مقدمہ ابن الصلاح میں امام ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ بخاری شریف کی پہلی حدیث ''انما الاعمال بالنیّات'' غریب ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ ضعیف ہے۔

بخاری و مسلم میں متعدد روایات اس لحاظ سے غریب ہیں کہ ان میں کہیں راوی متفرد ہوتا ہے مگر ہیں وہ صحیح۔

جامع ترمذی میں بہت سی روایات کے بارے میں آتا ہے کہ ''ھذا حدیث حسن اور حسن صحیح غریب'' اگر غرابت صحت کے منافی ہوتی تو یہ حسن اور صحیح کے ساتھ جمع نہ ہو سکتی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

ان الغرابة لاتنافی فی الصحة ویجوز ان یکون الحدیث صحیحاً غریباً — بلاشک غرابت صحت کے منافی نہیں ہے اور جائز ہے کہ حدیث صحیح غریب ہو۔

(مقدمہ مشکوٰۃ: صفحہ ۶۔ طبع اصح المطابع دہلی)

اسی طرح مطلق خبر واحد ہونا مضر نہیں اور نہ ہی محدثین نے اسے جرح مانا ہے۔

وحدة الراوی لیس بجرح عندنا ہمارے نزدیک وحدت راوی کی

(فواتح الرحموت: ج،ا۔ صفحہ:۴۳۵) کوئی جرح نہیں ہے۔

مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ابن کثیر کا اس روایت کو غریب جداً کہنا ضعیف جداً کے معنوں میں نہیں لیا جا سکتا ہے جیسا کہ موصوف نے لیا ہے بلکہ ان کی مراد راوی کا متفرد ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح محض خبر واحد ہونا بھی کوئی حرج نہیں جس کی بنا پر اس روایت کو قبول نہ کیا جائے لہذا اس روایت پر اُصول حدیث کی رو سے کوئی ایسا اعتراض وارد نہیں ہوتا جو اس کی صحت اور اس کے قابل استدلال ہونے پر اثر انداز ہو، اس لیے پوری اُمت نے اس روایت کو قبول کیا ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب

موصوف فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مغلوب الغضب ہونا ظاہر ہوتا ہے حالانکہ وہ محتاط، سمجھدار اور حدود اللہ کے پابند تھے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس واقعہ سے موصوف کا مذکورہ تاثر کسی صاحب علم سے منسوب نہیں بلکہ اسلاف واخلاف میں سے کسی نے بھی آج تک اس واقعہ پر یہ جرح نہیں کی۔ اگر یہ واقعہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مغلوب الغضب ہونے کی دلیل ہے تو وہ ان صحابہ کے بارے میں کیا کہیں گے جنہوں نے ازخود اقدام کرتے ہوئے توہین رسالت کے ارتکاب پر اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی مار ڈالا۔ انہی میں حضرت عمیر بن عدی بھی شامل ہیں جنہوں نے نابینا ہونے کے باوجود قبیلہ

خطمیہ کی اس عورت کو قتل کر ڈالا جو حضور ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتی تھی۔ حضور ﷺ نے نہ تو انہیں مغلوب الغضب کہا اور نہ ہی ان کی حوصلہ شکنی فرمائی بلکہ صحابہ کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ اگر کسی نے ایسے شخص کو دیکھنا ہو جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی غیبی مدد کی تو وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے اس اقدام سے آگاہ ہو کر انہیں اندھا کہہ کر ذکر کیا تو حضور ﷺ نے انہیں فرمایا کہ اسے اندھا مت کہو یہی تو بصارت والا ہے۔

اسی طرح حضرت عمیر بن اُمیہ نے بھی اپنی سابہ مشرکہ بہن کو قتل کر دیا، نابینا صحابی نے اپنی اُم ولد کو قتل کر دیا۔ کیا ان سب کو مغلوب الغضب کہا جائے گا یا دینی غیرت کا حامل؟ اس پر موصوف کو ضرور غور کرنا چاہیے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نہ تو صرف اس منافق کو جہنم واصل کیا تھا بلکہ ہر گستاخ کے حوالے سے ان کا یہی ردعمل ہوتا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے چند دیگر واقعات

ہم یہاں چند واقعات نقل کر دیتے ہیں جن سے یہ بات بے غبار ہو جائے گی کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام کسی وقتی کیفیت کے تحت نہیں تھا بلکہ آپ ایسے شخص کو مباح الدم ہی سمجھتے تھے اور اس کے قتل کو جائز سمجھتے تھے۔ ایک واقعہ تو موصوف نے خود اپنی تالیف یعنی ''توہین رسالت کے مسئلہ'' میں بیان کیا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ جب ابوسفیان کو طلب امان کے لیے حضور ﷺ کے پاس لے جارہے تھے تو راستے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی نظر پڑگئی اور انہوں نے نعرہ بلند کیا ''الحمد للہ الذی امکن منك بغیر عقد ولا عهد ''یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تم کسی معاہدے کے بغیر ہمارے ہاتھ لگ گئے ہو۔ پھر قریب تھا کہ وہ ابو سفیان کو قتل کردیتے لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں بچالیا اور انہیں نبی ﷺ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوگئے اور ان کے لیے امان حاصل کرلی۔

یہ واقعہ چونکہ موصوف نے خود نقل کیا ہے لہذا اس کی سند پر تو انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیا وہ یہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اس طرز عمل سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی غیرت ایمانی صاف نظر نہیں آتی یا اس سے بھی ان کے مغلوب الغضب ہونے کا تاثر قائم کرلیا جائے؟

ایک اور واقعہ حنین کے غنائم کی تقسیم کے موقع پر پیش آیا جس پر ایک شخص نے جب یہ کہا کہ حضور ﷺ آپ نے اس تقسیم میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو پیش نظر نہیں رکھا جسے سن کر سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے عرض کی کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کو قتل کردوں لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ اس طرح لوگ کہیں گے کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کروادیتے ہیں۔

صحیح مسلم کی یہ روایت ابن تیمیہ نے اپنی ''الصارم المسلول ''میں نقل کی ہے۔

اسی طرح ابن ابی بلتعہ کی روایت میں ہے کہ جب حاطب نے کہا کہ میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا تھا کہ میں کافر ہوں یا اس لیے کہ مجھے اپنے دین سے دلچسپی نہیں اور اس لیے کہ میں کفر پر راضی ہوں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس نے تم سے سچ کہا، اس پر بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ جنگ بدر میں حصہ لے چکا ہے اور تمہیں کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف جھانکا اور کہا کہ جو چاہو کرو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔

یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے اس کی سند پر بھی موصوف کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کیا وہ بتانا پسند فرمائیں گے کہ ان واقعات سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی غیرت دینی چھلکتی ہے یا موصوف کے سوئے فہم کے نتیجے میں پیدا ہونے والا یہ تاثر کہ وہ اس واقعہ سے مغلوب الغضب انسان دکھائی دیتے ہیں؟

چلیں ہم موصوف کی سہولت کے لیے ایک اور واقعہ نقل کر دیتے ہیں۔

غزوہ بنی مصطلق سے واپسی پر واقعہ اِفک پیش آیا جس میں عبداللہ بن اُبی کے حوالے سے حضرت زید بن ارقم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی، اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی پاس بیٹھے تھے انہوں نے فوری طور پر عرض کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

کہ پھر مدینہ میں بہت سی ناکیں کانپنے لگیں گی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ اگر آپ اس بات کو ناپسند فرماتے ہیں کہ مہاجرین میں سے کوئی اسے قتل کرے تو سعد بن معاذ یا محمد بن مسلمہ یا عباد بن بشر کو حکم دیجئے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر لوگ یہ باتیں کریں گے کہ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرادیا۔

یہ واقعہ ترمذی شریف میں موجود ہے۔ ان تمام واقعات سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہی بات نظر آتی ہے کہ آپ کسی بھی گستاخ کا وجود زمین پر برداشت نہیں فرماتے تھے۔ اگر موصوف ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہاں انہوں نے کسی اقدام سے پہلے حضور ﷺ سے اجازت طلب کی تو یہ نتیجہ کئی وجوہ سے مردود ہے:۔

پہلی وجہ:۔ جس منافق کو انہوں نے قتل فرمایا اس وقت چونکہ حضور ﷺ موجود نہیں تھے اس لیے انہوں نے اس کا کام تمام کر دیا البتہ فریقین سے یہ تصدیق کر لی کہ حضور ﷺ یہودی کے حق میں فیصلہ فرما چکے تھے اور دیگر مذکورہ واقعات میں انہوں نے حضور ﷺ سے اجازت اس لیے طلب فرمائی کہ حضور ﷺ وہاں تشریف فرما تھے اور اس صورت میں وہ حضور ﷺ کی اجازت طلب کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ حضرت ابوسفیان والے واقعہ میں بھی چونکہ حضور ﷺ تشریف فرما نہیں تھے تو انہوں

نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جہاں تک ان کے ردعمل کا تعلق ہے تو مذکورہ بالا تمام واقعات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کرے اسی لیے مذکورہ واقعات میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ان منافقوں کا سر قلم کر سکیں۔

دوسری وجہ:۔ وہ یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ ایسے شخص کی سزا شرعی طور پر قتل ہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے، اسی لیے انہوں نے تواتر کے ساتھ ایسے منافقوں کا سر قلم کرنے کی بات کی اور کسی موقع پر بھی اس سے کم تر سزا دینے یا ان کی جان بخش دینے کی بات ہرگز نہ فرمائی۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کسی کو چاہیں تو معاف فرما سکتے ہیں اسی لیے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوجوہ ان منافقین سے صرف نظر کرنے کا فیصلہ فرمایا تو انہوں نے اسے قبول کر لیا۔

تیسری وجہ:۔ آخری واقعہ جو ہم نے عبداللہ بن ابی کے حوالے سے نقل کیا ہے اس سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کرنے کی جو اجازت چاہی اس کا سبب موصوف کے فہم کے مطابق کوئی وقتی کیفیت، اشتعال یا جذباتی پن نہیں تھا۔ بلکہ آپ نے حکمت ودانش کے تقاضے پورے کرتے ہوئے یہ

مسئلہ بارگاہ رسالت میں عرض کیا کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ فرمایا کہ اس پر بہت سے اہل یثرب کی ناکیں کانپنے لگیں گی تو وہ فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا سمجھ گئے اور متبادل تجویز کے طور پر عرض کیا پھر یہ کام انصار میں سے کسی کے ذمے لگا دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا یہ مکالمہ دوٹوک طور پر یہ واضح کررہا ہے کہ ان کا یہ مشورہ یا اجازت طلب کرنا کسی جذباتی کیفیت کے سبب نہ تھا اور نہ ہی اشتعال کے باعث بلکہ وہ دینی غیرت وحمیت کا تقاضہ سمجھتے تھے کہ ایسے شخص کو قتل کردیا جائے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر زبان طعن دراز کرتا ہے۔

موصوف نے اس واقعہ کی روایت پر از روئے درایت جو جرح کی ہے اسی نوعیت کی جرح ان کے خاندان کے ایک بزرگ عالم شیخ صوفی عبدالحمید سواتی نے ''معالم العرفان فی دروس القرآن'' میں کی ہے وہ بھی یہی تاثر قائم کرتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا منافق کو یکدم قتل کردینا صحیح نظر نہیں آتا۔

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا منافق کو یکدم قتل کردینا بھی کچھ صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ صحیح احادیث میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں ایسے مواقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے بعض منافقین کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی مگر حضور علیہ السلام نے اجازت نہ دی۔ بخاری اور ترمذی شریف میں روایت موجود ہے کہ جب حضرت حاطب رضی اللہ عنہ ابن ابی بلتعہ سے غلطی ہوگئی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا: '' دعنی ان اضرب عنق هذا المنافق '' حضرت! آپ

مجھے چھوڑ دیں کہ اس منافق کی گردن اُڑا دوں، مگر حضور ﷺ نے منع فرما دیا تھا۔

ان تمام واقعات کے بارے میں ہم نے سطور بالا میں تفصیلاً اپنا نکتہ نظر واضح کر دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس روایت پر علمائے دیوبند میں سے کسی اور نے یہ مؤقف اختیار نہیں کیا بلکہ بعض نے اس مقام پر لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے منافقین اور اپنی تنقیص کے مرتکب لوگوں سے صرف نظر کرتے ہوئے جو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ "دعه فان الناس یتحدثون ان محمدا یقتل اصحابه او کما قال" (اسے چھوڑ و کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرواتے تھے) (مکمل بیان القرآن ۔۲۔۱۲۹)

صاحب "مکمل بیان القرآن" میں مزید لکھتے ہیں" اس کا اطلاق اس معاملہ میں نہیں ہوتا کیونکہ اس منافق کا معاملہ ایک کافر کے ساتھ تھا تو یہ سزا دینے سے غیر مسلموں میں الٹا اچھا تاثر قائم ہوتا کہ اہل اسلام غیر قوموں کے مقابلے میں بھی بظاہر اپنی قوم کے لوگوں تک امر حق قبول کرنے پر ایسا مجبور کرتے ہیں کہ نہ ماننے پر ان کی جان کی بھی راعیت نہیں کرتے۔

ہم نے سطور بالا میں ان تمام اعتراضات کا جواب دیدیا ہے جو موصوف نے اس واقعہ پر از روئے درایت وارد کیے تھے اور اب یہ بات قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ ان کے اعتراضات زیادہ وزنی ہیں یا ہمارا رد۔

دیگر روایات پر اعتراضات کا جائزہ

اس واقعہ کے بعد انہوں نے دیگر دو روایات پر بھی گفتگو کی ہے جن میں توہین کرنے والی عورتوں کو ماورائے عدالت از خود اقدام کرتے ہوئے قتل کرنے کا تذکرہ موجود ہے۔ ان میں ایک واقعہ تو نابینا صحابی کے بارے میں ہے جنہوں نے توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والی اپنی لونڈی کو قتل کر دیا جبکہ دوسرا واقعہ حضرت عمیر بن اُمیہ کا ہے جنہوں نے اپنی گستاخ بہن کو از خود اقدام کرتے ہوئے قتل کر دیا تھا۔

موصوف نے یہ دونوں واقعات بیان کرنے کے بعد ان کی استنادی حیثیت پر تو کوئی گفتگو نہیں کی البتہ ان کے بارے میں یہ کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مخصوص حالات کی رعایت سے ایسا قدم اُٹھانے والے افراد کا مؤخذہ تو نہیں کیا گیا لیکن اس سے یہ اخذ کرنا درست نہیں کہ یہاں توہین رسالت کا ارتکاب کرنے والے مجرموں کے متعلق عام افراد کو از خود اقدام کرنے کی کوئی عمومی اجازت دی گئی ہے۔ پھر انہوں نے ان واقعات کے بارے میں لکھا ہے کہ ان واقعات میں جن مخصوص پہلوؤں کو اس رعایت کا موجب کہا جا سکتا ہے وہ تین ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہاں جرم کے تحقق اور ثبوت کے معاملے میں کوئی خفا یا شبہ نہیں تھا۔ روایات میں جس اسلوب سے ان کا جرم بیان کیا گیا ہے، اس سے واضح ہے کہ ان (سب وشتم کرنے والوں) کا یہ طرز عمل عمومی طور پر معلوم و معروف تھا، یعنی ایسا نہیں تھا کہ جرم کا افشا یا اس کا ثبوت محض قاتل کے بیان پر منحصر تھا اور اس کے علاوہ اس کا کوئی ثبوت میسر نہیں تھا۔

دوسرے یہ کہ ان میں جرم کو ایک معمول اور عادت بنا لینے والے مجرموں کا ذکر ہوا ہے جو جان بوجھ کر اور قصداً اشتعال پیدا کر رہے تھے اور مسلسل تنبیہ کے باوجود ایسا کرنے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے۔

تیسرے یہ کہ یہاں جن افراد نے مجرموں کو قتل کیا انہوں نے ایک غیر معمولی جذبہ ایمانی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے عزیز ترین قرابت داروں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت و ناموس پر قربان کر دیا تھا۔

(توہین رسالت کا مسئلہ: ص: ۱۰۱۔۱۰۲)

مذکورہ تینوں نکات بیان کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے:

ان تینوں وجوہات کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہوگا کہ جرم کی سنگین نوعیت اور اس کے وقوع کے بالکل قطعی اور یقینی ہونے کی وجہ سے یہاں مجرم اُصولی طور پر مباح الدم ہو چکے تھے اور اس کے بعد اگر کسی نے انہیں قتل کر دیا تو زیادہ سے زیادہ اسے کوئی تعزیری اور تادیبی سزا دی جا سکتی تھی، لیکن چونکہ جان لینے والے افراد نے یہ قدم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں اُٹھایا تھا اور اس کے لئے بہن اور بیوی جیسے رشتوں تک کو قربان کر دیا تھا، اس لئے ان کی اس غیر معمولی غیرت و حمیت کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز پر کوئی سزا دینا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ ان واقعات سے اگر کوئی قانونی نکتہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جب مقتول کا جرم ثابت ہو اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے واقعتاً قتل کی سزا کا مستوجب ہو تو قاتل کو مخصوص صورت

حال کی رعایت سے سزا سے بری کیا جا سکتا ہے۔اس سے یہ کسی طرح اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی شخص کو قانون اور عدالت سے ماورا ایسے قضیے خود نمٹانے کی اجازت حاصل ہے۔

(توہین رسالت کا مسئلہ: ص:۱۰۲)

موصوف نے ان روایات کے حوالے سے جو گفتگو فرمائی ہے انتہائی کمزور اور غلط استنباط پر مبنی ہے یا تو انہوں نے ان روایات کو دقت نظر سے نہیں پڑھا یا وہ ان کو درست طور پر سمجھ نہیں پائے۔سب سے پہلی بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ جن خواتین کو قتل کیا گیا وہ اگر چہ گستاخی کرنے والی تھیں لیکن ان کا یہ گستاخانہ رویہ معروف و معلوم نہیں تھا بلکہ یہ انہی صحابہ کے علم میں تھا جنہوں نے انہیں قتل کیا اور ان کے خون کو خود زبان رسالت نے ھدر یعنی رائیگاں قرار دیا۔آپ ﷺ کے یہ ارشادات ایسے معاملے میں کامل راہنمائی دیتے ہیں، آج بھی اُمت حضور ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں شاتم رسول کو مباح الدم سمجھتی ہے اور اگر کوئی اشتعال میں آ کر اس گستاخ کو قتل کر ڈالے تو اس پر قصاص یا دیت کی صورت میں کوئی سزا نہیں۔

یہ بڑا باریک فرق ہے کیونکہ اگر شاتم مباح الدم ہے تو اسے از خود اقدام کرتے ہوئے قتل کر دینا کوئی ایسا گناہ نہیں ہے جس پر قتل کرنے والے پر قصاص یا دیت لازم ہو۔ہاں یہ بات درست ہے کہ سزا اور عقوبت سے بریت کے لئے قاتل کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ اس نے واقعتاً شاتم یا شاتمہ کو ہی قتل کیا تھا اور اس نے کسی ذاتی عناد کی وجہ سے ہرگز قتل نہیں کیا تھا۔اگر عدالت میں یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے

کہ مقتول یا مقتولہ کو شتم رسول کے جرم پر ہی از خود اقدام کرتے ہوئے قتل کیا گیا تھا تو کوئی بھی عدالت قاتل کو شرعی قوانین کے تحت سزا نہیں دے سکتی۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اگر ایسے شاتم یا شاتمہ کو قتل نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے خلاف مقدمہ قائم کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس پر توہین رسالت کا جرم ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اسے سزا دینے کے لئے عدالت ہی کافی ہے۔ جہاں تک ان روایات کے بارے میں موصوف نے جن مخصوص پہلوؤں کو اس رعایت کا موجب قرار دیا ہے وہ بھی سراسر بے بنیاد ہیں۔ اب ان پر قدرے تفصیل سے بات کرتے ہیں۔

تینوں نتائج درست نہیں

ہم کہتے ہیں موصوف مذکورہ تینوں نتائج اخذ کرنے میں خطا پر ہیں۔

اولاً، ان کا یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ یہاں جرم کے تحقق اور ثبوت کے معاملے میں کوئی اخفا یا شبہ نہیں تھا۔ روایات میں جس اسلوب سے ان کا جرم بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ ان کا یہ طرز عمل عمومی طور پر معلوم و معروف تھا۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ جرم کا افشا یا اس کا ثبوت محض قاتل کے بیان پر منحصر تھا اور اس کے علاوہ اس کا کوئی ثبوت میسر نہیں تھا۔

پہلے ہم نابینا صحابی والی روایت کا جائزہ لیتے ہیں:

عن ابن عباس رضی الله عنهما ان اعمی کانت له ام ولد تشتم النبی ﷺ وتقع فیه فینهاها فلا تنتهی ویزجرها فلا تنزجر قال فلما کانت ذات لیلة جعلت تقع فی النبی ﷺ وتشتمه فاخذ المغول فوضعه فی بطنها واتکا علیها فقتلها فوقع بین رجلیها طفل فلطخت ما هناك بالدم فلما اصبح ذکر ذلك لرسول الله ﷺ فجمع الناس فقال انشد الله رجلا فعل ما فعل لی علیه حق الاقام فقام الاعمیٰ یتخطی الناس وهو یتزلزل حتی قعد بین یدی النبی ﷺ فقال یا رسول الله ﷺ انا صاحبها کانت تشتمك وتقع فیك فانهاها فلا تنتهی وازجرها فلا تنزجر ولی

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک اندھے شخص کی ایک اُم ولد لونڈی تھی جو رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی اور آپ کی شان میں بے ہودہ گوئی کرتی تھی۔ وہ اسے منع کرتا مگر وہ باز نہ آتی تھی، وہ اسے ڈانٹتا تھا مگر وہ نہ رکتی تھی ایک رات بارگاہ رسالت میں دریدہ دہنی کرنے لگی تو اس اندھے نے بھالا لے کر اس کے پیٹ پر رکھا اور اُوپر سے دبا کر اسے قتل کر دیا۔ جب صبح ہوئی تو اس کا ذکر بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں ہوا۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: میں اس آدمی کو قسم دیتا ہوں جس نے اس عورت کو قتل کیا کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ یہ سن کر وہ نابینا شخص کھڑا ہو گیا اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا

منها اثنان مثل اللولوتين وكانت بي رفيقة فلما كان البارحة جعلت تشتمك وتقع فيك فاخذت المغول فوضعته في بطنها واتكات عليها حتى قتلتها فقال النبي صلى الله عليه وسلم الا اشهدوا ان دمها هدر

(فتح الودود في شرح سنن ابي داؤد: ۴۔۲۷۵، رقم:۴۳۶۱۔ سنن النسائی: ۳۔۸۵۴،رقم:۳۷۹۴)

آپ کے پاس آیا اور بیٹھ کر عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ اسے میں نے قتل کیا ہے، وہ حضور کو گالیاں دیتی تھیں۔ میں اسے منع کرتا تو وہ باز نہ آتی تھی اور ڈانٹ ڈپٹ کا اثر بھی نہیں لیتی تھی، میرے اس سے دوخوبصورت بیٹے ہیں وہ میری رفیقہ حیات تھی۔ گزشتہ رات جب آپ کو گالیاں دینے لگی تو میں نے بھالا لے کر اس کے پیٹ میں اُتار دیا یہاں تک کہ وہ مرگئی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''تم گواہ ہوجاؤ کہ اس کا خون رائیگاں ہے''۔

اس حدیث شریف کے متن سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے اُم ولدلونڈی کے قتل کا کوئی گواہ پیش نہ ہوا جس کے نتیجے میں حضور ﷺ نے مجمع کو قسم دے کر پوچھا کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟ چنانچہ نابینا صحابی دیگر صحابہ کی گردنیں پھلانگتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا بیان کردیا۔لہذا یہاں قاتل کے اعتراف پر ہی انحصار کیا گیا اور حضور ﷺ نے ارتکاب شتم پر نہ کوئی گواہی طلب کی اور نہ ہی مجمع میں سے کسی نے اُم ولد کے شاتم ہونے پر گواہی دی ورنہ نابینا صحابی اس کے سبّ وشتم کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے اسے سبب قتل نہ قرار دیتے بلکہ وہ یوں کہتے کہ جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے کہ وہ سبّ وشتم کرتی تھی۔

اسی طرح دوسرے واقعہ میں بھی جب حضرت عمیر بن اُمیہ نے اپنی مشرکہ بہن کو قتل کر دیا تو اس مشرکہ کے قتل کا معاملہ سربستہ راز ہی رہا، حتی کہ جب حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کو خود یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کسی اور آدمی کو اس کا قاتل سمجھ کر ناحق قتل کر دیا جائے گا تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سارا ماجرا بیان کر دیا اور اس کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ لہٰذا دونوں واقعات میں کہیں بھی کوئی گواہ پیش نہ ہوا بلکہ قتل کرنے والوں کے اعتراف سے ہی ان عورتوں کے قتل کا عقدہ کھلا۔

روایت کا متن ملاحظہ فرمائیں:

حضرت عمیر بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کا اپنی سابہ مشرکہ بہن کو قتل کرنا

حضرت عمیر بن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے اپنی مشرکہ بہن کو جہنم واصل کر دیا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دیتی تھی۔

عن عمير بن امية رضي الله عنه انه كانت له اخت فكان اذا خرج الى النبي صلى الله عليه وسلم آذته فيه، وشتمت النبي صلى الله عليه وسلم وكانت مشركة فاشتمل لها يوما على السيف ثم اتاها فوضعه عليها فقتلها فقام بنوها فصاحوا، وقالوا: قد علمنا من قتلها افتقتل امنا وهىنا قوم لهم آباء وامهات

حضرت عمیر بن اُمیہ سے روایت ہے کہ ان کی ایک مشرکہ بہن تھی جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جاتے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ان کو اذیت دیتی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دیتی۔ ایک دن یہ تلوار لے کر آئے اور اس کو قتل کر دیا چنانچہ اس کے بیٹے کھڑے ہوئے اور چیخنے لگے اور کہنے لگے ہمیں پتہ ہے کہ اس کو کس نے قتل کیا ہے۔

صرف ان کے سامنے ہی اہانت رسول کرتی تھیں اس لیے وہ انہیں بادل نخواستہ برداشت کرتے رہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت رشتہ داری پر غالب آگئی تو انہوں نے قرابت داری کا لحاظ کیے بغیر انہیں واصل جہنم کر دیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ شارع علیہ السلام کا منشا یہ تھا کہ انہیں مہلت دی جائے اور نہ ہی ان صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ سب وشتم پر مصر پائیں تو انہیں قتل کر دیں۔ اگر انہیں وہ ایک ہی دفعہ سب وشتم کرنے پر بھی قتل کر دیتے تو بھی ان کا خون رائیگاں ہی قرار دیا جاتا کیونکہ اس کی علت سب وشتم رسول ہے نہ کہ اس پر اصرار۔ اگر ان کے پاس اپنے بیان کردہ اس مؤقف پر کوئی دلیل شرعی موجود ہے تو وہ اسے سامنے لائیں؟

صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے مہلت دینے کا اصل سبب:۔

صاف ظاہر ہے کہ قرابت داری اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے انہوں نے شتم رسول کا ارتکاب کرنے والیوں کو فوری طور پر قتل نہ کیا لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناموس کا پاس غالب آگیا تو انہوں نے قرابت داری کا لحاظ کیے بغیر انہیں قتل کر ڈالا۔ ان کا فوری قتل نہ کرنا اور توقف کرنا قربت داری کے باعث ایک فطرتی امر تھا نہ کہ یہ شارع علیہ السلام کا منشا تھا۔ تعجب ہے کہ وہ صحابہ کرام کے توقف کے اس سبب کو نہ سمجھ سکے حالانکہ انہوں نے خود یہ بات بیان کی ہے۔

''ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخلص اور وفادار صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کے بدترین دشمنوں اور آپ کی توہین وتنقیص کرنے والے افراد کے ساتھ اپنے شخصی، خاندانی اور قبائلی تعلقات کی وجہ سے ہمدردانہ رویہ اپنایا اور انہیں سزا

سے بچانے کی کوشش کی، لیکن اللہ یا اللہ کے رسول نے اس پر کوئی منفی تبصرہ نہیں کیا اور نہ اسے دین وایمان کے منافی قرار دے کرانہیں کوئی تنبیہ کی۔"

(توہین رسالت کا مسئلہ:۷۴)

کاش وہ اپنی تحریر کردہ ان سطور پر ہی غور فرما لیتے تو بہت سے عقدے حل ہو جاتے۔ان کی درج بالا تحریر سے یہ نتائج بآسانی اخذ کیے جاسکتے ہیں:

(۱)۔ حضور ﷺ کے مخلص اور وفادار صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور ﷺ کے دشمنوں اور حضور ﷺ کی توہین وتنقیص کرنے والوں کو سزا کا حق دار ہی سمجھتے تھے۔تبھی تو ان میں سے بعض نے ایسے مجرموں کو سزا سے بچانے کی کوشش کی، سزا سے بچانے کی کوشش کرنا دراصل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ توہین رسالت کے مجرم مستحق سزا تھے۔اگر وہ عبداللہ ابن ابی سرح کے معاملہ ہی کو دیکھ لیں تو خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان کی معافی کیلئے حضور ﷺ سے سفارش کی اور انہیں بیعت کیلئے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا لیکن آپ ﷺ نے تین مرتبہ انکار فرمایا۔بالآخر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے اصرار پر بیعت فرما لیا لیکن بیعت فرمانے کے بعد حضور ﷺ نے وہاں موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے فرمایا کہ کیا تم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہ تھا جو مجھے اس کو بیعت نہ کرتے دیکھ کر اسے قتل کر دیتا۔یہ واقعہ اس قدر مشہور ہے کہ اس پر کسی بھی صاحب علم نے اختلاف نہیں کیا۔اس سے معاملہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا منشا اسے قتل کرنے کا ہی تھا لیکن حضرت عثمان غنی رضی

اللہ عنہ کی سفارش پر آپ ﷺ نے اسے اپنا حق سمجھتے ہوئے معاف فرما دیا۔

(۲)۔ بعض صحابہ کرام کی ان مجرموں کے ساتھ ہمدردی کا سبب ان کے ساتھ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے شخصی، خاندانی اور قبائلی تعلقات بھی تھے اور انہوں نے گستاخی کرنے والوں کو نادم و شرمندہ بھی پایا تھا تبھی وہ انہیں معافی دلوانے پر رضامند ہوئے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی یہ سمجھتے تھے کہ اگر چہ یہ مجرم موت کی سزا کا حقدار ہے لیکن حضور ﷺ کو چونکہ یہ اختیار حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو اسے معاف فرما سکتے ہیں اس لیے انہوں نے عبداللہ بن ابی سرح کیساتھ تعلق کی بنا پر اس کیلئے حضور ﷺ سے معافی چاہی۔

(۳)۔ ان مجرموں کیساتھ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمدردانہ رویہ کو دین وایمان کے منافی اسلئے قرار نہیں دیا گیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بخوبی جانتے تھے کہ حضور ﷺ کو انہیں معاف کرنے کا حق اور اختیار حاصل تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دراصل حضور ﷺ کو حاصل اس اختیار کے ذریعے انہیں معافی دلانا چاہتے تھے۔ اگر حضور ﷺ کی ظاہری حیات کے بعد یہ معاملہ درپیش ہوتا تو یقیناً کوئی بھی صحابیؓ ایسے مجرم سے ہمدردی کا اظہار نہ کرتا۔ اسی طرح حضور ﷺ سے معافی کی سچی طلب دیکھے بغیر انہوں نے بھی حضور ﷺ کے دشمن اور شاتم سے کوئی ہمدردی نہ رکھی بلکہ وہ تو والد جیسے محترم رشتے کا بھی لحاظ نہ رکھتے ہوئے اسے قتل کرنے پر تیار ہو جاتے اگر اس سے سب وشتم کا ارتکاب ہوا ہوتا۔

تیسرا نتیجہ اخذ کرنے میں بھی موصوف خطا پر ہیں، کیونکہ حضور ﷺ کی نسبت یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی کو ناحق قتل کرنے پر اس لیے معاف فرما دیتے کہ قاتلین نے غیر معمولی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے قریبی عزیز واقارب کو حضور ﷺ کی ناموس پر قربان کر دیا تھا۔

یہ نتیجہ اخذ کرنا دراصل حضور ﷺ کے منصفانہ مزاج اور اعلیٰ تعلیمات کے سراسر منافی ہے بلکہ ایسا طرز عمل اختیار کرنا کسی نبی علیہ السلام کے شایان شان نہیں ہو سکتا۔

موصوف نے خود ہی بیان کیا ہے:

''شرعی احکام اور خاص طور پر مختلف جرائم پر سزاؤں کی تعیین میں اصل اور اساس کی حیثیت انسانی احساسات وجذبات کو نہیں، بلکہ اس چیز کو حاصل ہے کہ اس باب میں شارع کا منشا کیا ہے اور وہ کس جرم پر کس نوعیت کی سزا دلوانا چاہتا ہے۔''

انہوں نے مزید لکھا ہے:

''نبی ﷺ نے یہی بات اس موقع پر واضح فرمائی جب آپ ﷺ کو یہ بتایا گیا کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے مرد کو دیکھوں گا تو تلوار لے کر اسے وہیں قتل کر دوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت سعدؓ کی غیرت قابل ستائش ہے لیکن میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے۔

(بخاری، ۶۴۵۴)

شارحین حدیث کی تشریح کے مطابق آپ کی مراد یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ غیرت مند ہونے کے باوجود ایسے اقدام کی اجازت نہیں دی تو انسان کو بھی ایسے موقع پر اپنے جذبہ غیرت کو شارع کی مقرر کردہ حدود کا پابند رکھنا چاہیے اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے''
(توہین رسالت کا مسئلہ:۶۰)

لہذا جو ہستی غیرت وحمیت کی حدود کو متعین کرتی ہے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی غیرت کی ان شرعی حدود کے تابع دیکھنا چاہتی ہے وہ بھلا نابینا صحابی اور حضرت عمیر بن امیہ کا اپنے قریبی عزیزوں کو اہانت رسول کی پاداش میں ہی سہی قتل کر دینا کیسے گوارا فرما سکتی تھی اگر یہ سزا خود ان کے منشا کے مطابق درست نہ ہوتی؟ آپ کے اس اقدام کی مذکورہ بالا توجیہہ کرنا بھی دراصل نرم سے نرم الفاظ میں ایک جسارت ہی ہے اور پوری امت میں سے شاید ہی کسی نے حضور ﷺ کے اس اقدام کی یہ توجیہ کی ہو۔

سزا کے نفاذ کا اختیار

﴿یہ بحث بھی چونکہ موضوع سے براہِ راست متعلق ہے
لہذا اسے بھی کتاب ہذا کے اہم حصے کے طور پر شامل کیا گیا ہے﴾

سزا کے نفاذ کا اختیار

موصوف نے شکوہ کیا ہے کہ بعض اہل علم نے یہ فرمایا ہے کہ توہین رسالت پر سزائے موت کا قانون بن جانے کے بعد اس سے کم تر سزا کی بات کرنا بھی توہین اور استخفاف کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر کسی صاحب علم نے دلیل شرعی کے ساتھ اس قانون کے تحت کم تر سزا کی بات کی ہو تو اس دلیل پر ضرور غور ہونا چاہیے اور یہ استدلال پیش کرنے والا ہماری دانست میں بھی توہین اور استخفاف کا مرتکب قرار نہیں پاتا لیکن ان لوگوں کا کیا کیا جائے جو اس شرعی قانون کو کالا کہتے ہیں اور جو اس کے تحت ملنے والی سزا کو سخت اور ظالمانہ کہتے ہیں؟ اگر موصوف ان کے لئے بھی اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں تو پھر انہیں ضرور سوچنا چاہیے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ انہیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جس قانون کے مسودے میں متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ تھے وہ کسی پارلیمنٹ نے منظور نہیں کیا تھا بلکہ اسے جنرل ضیاء الحق نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے نافذ کیا تھا۔ اسی طرح متبادل سزا کے الفاظ حذف کرنے کا فیصلہ بھی کسی قانون ساز ادارے یعنی پارلیمنٹ نے نہیں کیا تھا بلکہ وفاقی شرعی عدالت نے کیا تھا جس کا آئینی وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ ملک میں رائج قوانین کے خلاف اسلام

ہونے کا جائزہ لیتی ہے۔ پھر آئینی طور پر یہ عدالت اس بات کی پابند ہے کہ وہ کتاب وسنت کے منضبط احکام کی روشنی میں کسی بھی قانون کے خلاف اسلام ہونے کا جائزہ لے، اس پر کسی بھی فقہی مکتب فکر کی آرا کی پابندی ہرگز نہیں ہے۔ جب کوئی قانون ملک کی یہ عدالت کتاب وسنت کے منضبط احکام کے موافق قرار دیدے تو اس پر علمی دائرے ہی میں سہی بحث ومباحثہ کے دروازے کھولنا ایک بیکار شغل اور سعی لاحاصل ضرور ہے۔ ہاں اس کی معقول صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اگر کوئی صاحب علم اس قانون کو اس کی موجودہ صورت میں کتاب وسنت کے منضبط احکام کے منافی سمجھتا ہے تو وہ اسے دوبارہ وفاقی شرعی عدالت میں اپنے علمی دلائل کے ساتھ چیلنج کردے اور وہاں اپنا زور بیان وقلم صرف کردے۔ اگرچہ یہ عدالت کے ساتھ مذاق کے مترادف ہوگا لیکن پھر بھی اس بات کا امکان موجود ہوگا کہ اگر اس قانون کو چیلنج کرنے والے صاحب علم کے دلائل قوی ہونگے تو وہ اس قانون میں مجوزہ تبدیلی کرواسکے گا۔ البتہ اس مسئلہ پر ہماری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ جو دلائل موصوف کی طرف سے سامنے آئے ہیں ان کی بنا پر اس قانون کو چیلنج کرنا خود ان کے لئے ہواخیزی کا باعث ہوگا۔

پھر یہ بات بھی بے حد قابل غور ہے کہ ائمہ ثلاثہ سے بعض متقدمین احناف نے جو اختلاف کیا ہے وہ سزا کی مقدار پر نہیں بلکہ اس کی نوعیت بالکل الگ ہے، جیسے مسلمان شاتم کے بارے میں بعض احناف کا مؤقف توبہ کی

قبولیت کا ہے لیکن انہیں بھی اس بات سے انکار نہیں کہ اس کی سزا موت ہے اسی طرح غیر مسلم شاتمین کے بارے میں بھی ان کا مؤقف یہ ہے کہ اعلانیہ اظہار یا تکرار جرم پر انہیں تعزیراً اور تادیباً سزا دی جائے گی جو کہ قتل بھی ہوسکتی ہے۔ گویا سزا کی مقدار کو تو اجماعی مسئلہ کہا جا سکتا ہے لہذا اس پر قیل وقال کا کیا جواز ہے؟

ہم نے اس سے پہلے بھی یہ واضح کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض شاتمین کو معاف ضرور فرمایا لیکن جس کو سزا دی وہ موت سے کم تر ہرگز نہیں تھی۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توہین رسالت پر کبھی بھی کسی غیر مسلم کو موت سے کم تر سزا نہیں دی۔ اسی طرح یہ بات بالکل واضح اور مبرہن ہے کہ گستاخ کے ساتھ معاملہ کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو بعض صورتوں میں کسی حکمت کا لحاظ رکھا کیونکہ اصلاً آپ کو انہیں معاف کرنے کا حق حاصل تھا لیکن اُمت میں سے کسی نے ان حکمتوں کا لحاظ نہیں رکھا اور علی الاطلاق شاتم کو سزا دینے کا مؤقف ہی اختیار کیا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اسلامی ریاست میں کسی کو سزا دینے کا اختیار ریاست کو ہی حاصل ہے لیکن ہمیں اس امر کا جائزہ بھی دیانتداری سے لینا چاہیے کہ اگر کوئی مباح الدم شخص کو ازخود اقدام کرتے ہوئے قاضی یا امام سے سبقت لے کر قتل کر دیتا ہے تو اس پر ائمہ کرام کیا رائے رکھتے ہیں۔

ائمہ اربعہ کی تصریحات

ہم یہاں پہلے ائمہ اربعہ کی تصریحات اس مسئلہ پر نقل کرتے ہیں اور بعد میں ... تفصیل کے ساتھ بیان کیے دیتے ہیں تا کہ اس

مسئلہ پر کوئی اشکال باقی نہ رہے۔

فقہائے کرام نے بھی اس مسئلہ کو واضح کر دیا ہے جو شخص شرعاً واجب القتل اور مباح الدم ہو اور اگر کوئی دوسرا شخص اسے از خود قتل کر دے تو اس قتل کرنے والے پر کوئی قصاص یا دیت لازم نہیں آئے گی کیونکہ دیت اور قصاص آدمی کی عزت اور جان کی حرمت کی وجہ سے لازم آتے ہیں۔ گستاخ اور مرتد کی عزت و جان کی کوئی حرمت نہیں ہوتی اسی لیے شریعت اسے مباح الدم قرار دیتی ہے اور ایسے مباح الدم کو ماورائے عدالت قتل کرنے والے پر بھی کوئی قصاص یا دیت لازم نہیں آتی۔

اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مذکورہ متعدد فیصلے ہیں:

۱۔ معروف حنفی فقیہ امام سرخسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ومن قتل حلال الدم لا شیء علیه کمن قتل مرتداً (المبسوط: ٦۔١٢١)	جس شخص نے حلال الدم (جس کو قتل کرنا جائز ہو) کو قتل کیا اس پر کوئی شے نہیں (کوئی سزا نہیں) جیسا کہ کوئی شخص مرتد کو قتل کر دے۔

۲۔ شوافع کا موقف ملاحظہ فرمائیں:

لوقتل المسلم مرتداً لم یکن علیه شیء (الام: ٦۔٨٨)	اگر کوئی مسلمان کسی مرتد کو قتل کر دے تو اس قاتل پر کوئی الزام نہیں

۳۔ومن قتل مرتداً قبل ان يستتاب او جرحه فاسلم ثم مات من الجرح فلا قود ولا دية (مختصر المزنی:۱۔۲۷۵)

جس شخص نے مرتد کو اس کے توبہ کرنے سے پہلے پہلے قتل کر دیا یا زخمی کر دیا اس کے بعد وہ مرتد اسلام لے آیا پھر اس زخم کی وجہ سے مر گیا تو قاتل پر یا زخمی کرنے والے پر نہ قصاص لازم ہے نہ دیت۔

۴۔حنابلہ کا مؤقف ملاحظہ فرمائیں:

لا يجب القصاص بقتل حربی ولامرتد ولا زان محصن وان كان القاتل ذمية وهو المذهب وعليه الاصحاب وقال فی الرعاية وتبعه فی الفروع ويحتمل قتل ذمی واشار بعض اصحابنا اليه قاله فی الترغيب لان الحد لنا والامام نائب نقله فی الفروع : فعلی المذهب : لا دية عليه ايضا جزم به فی المحرروالوجيز

(حربی مرتد اور شادی شدہ زانی کو قتل کرنے کی وجہ سے قاتل سے قصاص لینا واجب نہیں ہوگا اگرچہ قاتل ذمی ہی ہو یہی مختار مذہب ہے اور ہمارے اصحاب کا فتویٰ بھی اسی پر ہے) اور ''رعایہ'' میں ہے اور اسی کی اتباع ''فروع'' میں کی گئی ہے کہ ذمی کے قتل میں بھی یہی احتمال ہے اور ہمارے بعض اصحاب نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

والفروع وغیرهم وعلى المذهب: يعزر فاعل ذلك للاشتيات على ولي الامر كمن قتل حربيًا وفي عيون المسائل، تعزيره فائدة:قال في الفروع: فكل من قتل مرتداً او زانيا محصنا ولو قبل توبته عند حاكم والمراد: قبل التوبة قاله صاحب الرعاية فهدر وان كان بعد التوبة ان قبلت ظاهراً فكاسلام طارى

(الانصاف:۳-۶۲۳-باب شروط القصاص)

''ترغیب'' میں اس بات کے بارے میں کہا ہے کہ حدیں ہمارے لیے ہیں اور امام نائب ہے (جریان حد کے لیے) اس بات کو ''فروع'' کتاب میں بھی نقل کیا ہے۔

مذہب حنبلی کے مطابق: اس پر دیت بھی نہیں ہے اور اتفاق ظاہر کیا ہے اس بات پر ''محرر'' ''وجیز'' ''فروع'' اور ان کے علاوہ دیگر کُتب میں مذہب حنبلی کے مطابق ایسا کرنے والے کو تعزیر کیا جائے گا اس لیے کہ وہ معاملے کو اُولی الامر کے پاس نہیں لے کر گیا جیسا کہ حربی کو قتل کرنے والے کے لیے حکم ہے۔

فروع میں کہا ہے کہ ہر وہ شخص جس نے مرتد اور شادی شدہ زانی کو قتل کیا اگر چہ اسے حاکم کے پاس توبہ کرنے سے پہلے قتل کیا پس اس کا خون صاحب رعایہ کے نزدیک رائیگاں جائے گا خواہ توبہ کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس نے بظاہر اسلام قبول کیا پس اس کا حکم اسلام طاری (مجبوراً اسلام قبول کرنے والا) کی طرح ہوگا۔

۵۔لا یجب القصاص بقتل حربی لا نعلم فیه خلافًا ولایجب بقتله دیة ولا کفارة لانه مباح الدم علی الاطلاق اشبه الخنزیر ولا ن الله تعالیٰ امر بقتله فقال الله تعالیٰ: "اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ" وسواء کان القاتل مسلما او ذمیا لما ذکرنا و کذلك المرتد لایجب بقتله قصاص ولا دیة ولا کفارة وان قتله ذمی

(الشرح الکبیر:۹۔۵۱:باب شروط القصاص)

پس قصاص واجب نہیں ہوگا حربی کے قتل کے ساتھ ہم اس میں اختلاف نہیں جانتے اور حربی کے قتل کرنے سے نہ تو دیت واجب ہے اور نہ کفارہ کیونکہ یہ مباح الدم علی الاطلاق (یعنی مطلقاً اس کا قتل کرنا جائز ہے) اس لیے کہ اس کی مشابہت خنزیر کے ساتھ ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: (مشرکین کو جہاں جیسے پاؤ قتل کرو) برابر ہے کہ قتل کرنے والا مسلمان ہو یا ذمی ہو، دیت یا کفارہ لازم نہیں ہوگا اگرچہ ذمی ہی نے اسے کیوں نہ قتل کیا ہو۔

٦ ـ الثاني: عصمة المقتول بان لايكون مهدر الدم فلا كفارة ولا دية على قاتل حربي او مرتد او زان محصن ولو انه مثله في عدم العصمة بال قتل حربي حربياً او مرتداً او زانيا محصناً وعكسه لوجود الصفة المبيحة لدمه ويعذر قاتل لافتنائه على ولي الامر

(منار السبیل:۲۔۲۱۸باب شروط القصاص فی النفس)

(قصاص اور دیت کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ مقتول معصوم ہو بایں طور کہ وہ مہدر الدم نہ ہو کہ اس کے قتل کی وجہ سے کسی پر کوئی قصاص یا دیت لازم آئے اور اس کا خون ضائع نہ ہو)۔ پس قاتل حربی مرتد یا شادی شدہ زانی پر نہ دیت ہے اور نہ کفارہ (کیونکہ یہ مہدر الدم ہیں)۔ اگرچہ اس کی مثل عدم معصیت میں ہے بایں طور کے قتل کیا حربی نے حربی کو یا مرتد کو یا زانی محصن کو یا اس کے برعکس معاملہ ہو، واسطے اس صفت کے پائے جانے سے جو اس کے دم کو مباح کرنے والی ہے اور قاتل تعزیر کیا جائے گا اس لیے کہ وہ اُولی الامر کے پاس معاملہ لے کر نہیں گیا۔

۷۔الثانی :ان یکون المقتول معصوماً فلا یجب قصاص ولا دیة ولا کفارة بقتل حربی ولا مرتد (الاقناع:۴۔۱۷۳:باب شروط القصاص)

(قصاص اور دیت کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ مقتول معصوم ہو،اگر مقتول معصوم نہ ہو تو اس کے قاتل پر قصاص یا دیت واجب نہیں ہوگی جیسے حربی اور مرتد کو قتل کرنے والے پر کوئی قصاص یا دیت واجب نہیں ہوگی)۔اگر مقتول معصوم تر ہو پس نہ تو قصاص واجب ہوگا نہ دیت اور نہ ہی کفارہ ،حربی کے قتل کرنے کے ساتھ اور نہ ہی مرتد کے قتل سے۔

اب فقہائے احناف کا اس مسئلہ پر نکتہ نظر ملاحظہ فرمائیں جنہوں نے اس مسئلہ کو کھل کر واضح کر دیا کہ مسلمان اگر ارتداد اختیار کر لے تو اسے توبہ کا موقع دینا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے ۔لہذا اگر کوئی ایسے مباح الدم شخص کو از خود اقدام کر کے قتل کر ڈالے تو قاتل پر کوئی قصاص یا دیت نہیں۔ترک واجب پر زیادہ سے زیادہ کراہت تنزیہی کا حکم لگایا جائے گا۔

امام قدوری فرماتے ہیں:

فان قتله قاتل قبل عرض الاسلام علیه کره له ذلك و لا شی علی القاتل (القدوری:۲۶۲)

پس اگر اسے کسی قاتل نے قتل کر دیا اس پر اسلام پیش کرنے سے قبل تو یہ اس کے لیے مکروہ ہے اور قاتل پر کوئی چیز نہیں۔

شیخ الاسلام ابوبکر حداد یمنی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

لان القتل مستحق علیه بکفره و الکفر مبیح الدم و العرض بعد بلوغ الدعوة غیر واجب

(الجوهرة النیرة: ج۲،ص۳۵۸)

کیونکہ وہ اپنے کفر کی وجہ سے قتل کا مستحق ہے اور کفر خون کو مباح کرنے والا ہے اور دعوت اسلام پہنچنے کے بعد اسلام کا پیش کیا جانا واجب نہیں ہے۔

شیخ الاسلام برہان الدین فرغانی مرغینانی فرماتے ہیں:

(فان قتله قاتل قبل عرض الاسلام علیه کره له ذلك و لاشی علی القاتل) و معنی الکراهیة ههنا ترك المستحب و انتفاء الضمان لان الکفر مبیح و العرض بعد بلوغ الدعوة غیر واجب

(الهدایة: ج۲،ص۲۶۰)

(پس اگر اسے کسی قاتل نے قتل کر دیا اس پر اسلام پیش کرنے سے قبل تو یہ اس کے لیے مکروہ ہے اور قاتل پر کوئی چیز نہیں) اور کراہیت کا معنی یہاں مستحب کو ترک کرنا ہے اور تاوان کی نفی ہے کیونکہ کفر مبیح ہے اور اسلام کا دعوت اسلام پہنچنے کے بعد پیش کیا جانا واجب نہیں۔

مجتہد امام ابن ہمام فرماتے ہیں:

(فان قتله قبل عرض الاسلام عليه)او قطع عضوا منه(كره له ذلك و لا شي على القاتل) و القاطع (لان الكفر مبيح) و كل جناية على المرتد هدر(و معنى الكراهة ههنا ترك المستحب) فهي كراهة تنزيه

(فتح القدير :ج۵،ص۳۱۰)

(پس اگر اسے کسی نے قتل کر دیا اسلام اس پر پیش کرنے سے قبل) یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا(یہ اس کے لیے مکروہ ہے اور قاتل پر کوئی چیز نہیں) اور نہ ہی عضو کاٹنے والے پر (کیونکہ کفر مبیح ہے) اور مرتد پر ہر جنایت باطل ہے(اور کراہت کا معنی یہاں مستحب کا ترک کرنا ہے)وہ کراہت تنزیہی ہے۔

حافظ علامہ بدرالدین عینی (ت:۸۵۵ھ) فرماتے ہیں:

(فان قتله قاتل قبل عرض الاسلام عليه كره له ذلك و لاشى على القاتل)لان القتل وجب عليه بالنصوص لمجرد الكفر فلم يجب الضمان على قاتله لوجود المبيح (ومعنى الكراهية ههنا ترك المستحب) لان فى القتل تفويت العرض المستحب

(البنايه : ج۹،ص۳۸۲)

(پس اگر اسے کسی قاتل نے قتل کر دیا اس پر اسلام کے پیش کیے جانے سے قبل تو یہ مکروہ ہے اور قاتل پر کوئی چیز نہیں) کیونکہ قتل اس پر نصوص سے واجب ہے محض کفر کی وجہ سے پس مرتد کے قاتل پر تاوان نہیں ہوگا مباح کرنے والے امر کے وجود کی وجہ سے (اور کراہت کا معنی یہاں مستحب کا ترک کرنا ہے) کیونکہ اس کو قتل کرنے میں اس پر اسلام پیش کرنا فوت ہوتا ہے جو مستحب ہے۔

امام قاضی خان اوزجندی فرماتے ہیں:

وردۃ الرجل تبطل عصمۃ نفسہ حتی لو قتلہ قاتل بغیر اذن امر القاضی عمداً او خطأ او بغیر امر السلطان او تلف عضوا من اعضائہ لاشی علیہ
(فتاویٰ قاضی خان: ج۴،ص۴۲۷)

اور آدمی کا ارتداد اس کی جان کی عصمت وحفاظت کو باطل کر دیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کو کسی قاتل نے قاضی کی اجازت کے بغیر قتل کر دیا جان بوجھ کر یا غلطی سے یا سلطان کی اجازت کے بغیر یا اس کے اعضاء میں سے کوئی عضو تلف کر دیا تو اس پر کوئی چیز نہیں۔

امام شمس الدین محمد خراسانی قہستانی فرماتے ہیں:

(وقتلہ) ای المرتد (قبل العرض) ای عرض السلام علیہ (ترک ندب) کما مر (بلا ضمان) ودیۃ علی القاتل لان الارتداد یبیح القتل
(جامع الرموز: ج:۲/ص:۵۸۳)

(اور اس کو قتل کرنا) یعنی مرتد کو (پیش کرنے سے قبل) یعنی اس پر اسلام پیش کرنے سے قبل (مستحب کو ترک کرنا ہے) جیسا کہ گزر چکا ہے (بغیر تاوان کے) اور دیت کے کیونکہ ارتداد اس کے قتل کو مباح کر دیتا ہے

فتاویٰ ہندیہ میں ہے؛

وان قتلـه قـاتـل قبل عـرض الاسلام او قطع عضوا منه كره تلك كراهة تنزيه هكذا فى فتح القدير -فلا ضمان عليه لكنه اذا فعل بغير اذن الامام ادب على ما صنع كذا فى غاية البيان
(الفتاویٰ الهندية: ج:۲/ص:۲۵۴)

اور اگر اسے کوئی قاتل قتل کردے اسلام پیش کرنے سے قبل یا اس کا کوئی عضو کاٹ دے تو یہ مکروہ ہے، مکروہ تنزیہی اسی طرح فتح القدیر میں ہے۔ اس پر کوئی تاوان نہیں لیکن جب وہ یہ کام امام کی اجازت کے بغیر کرے تو امام اس کو ادب سکھائے گا اس پر جو اس نے کیا اسی طرح غایۃ البیان میں ہے۔

امام حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

و كره قتله قبله ولم يضمن قاتله
(كنز الدقائق :ص۲۱۳)

اور مکروہ ہے کہ اس کا قتل کیا جانا اور اس کے قاتل پر تاوان نہیں۔

شیخ ابن نجیم فرماتے ہیں:

اى قبـل عـرض الاسـلام لان الاسلام مرجو قـال فى الهداية: معنى الكراهة هنا ترك المستحب له يعنى فهى كراهة تنزيه و هو مبنى على القول باستحباب العرض
(البحر الرائق: ج۵، ص:۲۱۷)

یعنی اسلام کے پیش کیے جانے سے پہلے کیونکہ اس کے اسلام کی امید ہے ہدایہ میں کہا: اور کراہیت کا معنی یہاں مستحب کو ترک کرنا ہے۔ یعنی وہ کراہت تنزیہی ہے اور وہ مبنی ہے اسلام پیش کرنے کے مستحب ہونے کے قول پر۔

امام فخر الدین عثمان بن علی زیلعی فرماتے ہیں:

اى كره قتله وبل عرض الاسلام عليه لان فى قتله تفويت العرض المستحب و قال صاحب الهداية و معنى الكراهية هنا ترك المستحب قال رحمه الله :(لم يضمن قاتله) لان الكفر بوصف الحراب مبيح والعرض بعد بلوغ الدعوة غير واجب فلم يضمن لذلك و لقوله عليه السلاة و السلام من بدل دينه فاقتلوه

(تبيين الحقائق :ج۴،ص۱۷۳)

یعنی اس کا قتل مکروہ ہے اور بلکہ اس پر اسلام پیش کیا جائے گا کیونکہ اس کے قتل میں اسلام پیش کیے جانے کا فوت ہونا ہے جو مستحب ہے۔صاحب ہدایہ نے کہا یہاں کراہیت کا معنی مستحب کو ترک کرنا ہے آپ نے فرمایا: (اس کے قاتل پر تاوان نہیں) کیونکہ کفر حرابہ کے وصف کے ساتھ مباح کرنے والا ہے اور دعوت پہنچنے کے بعد اسلام کا پیش کیا جانا واجب نہیں پس اس وجہ سے اس پر تاوان نہیں ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی وجہ سے کہ جو اپنا دین تبدیل کرے اس کو قتل کردو۔

امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:

فقال ابو حنیفة و ابو یوسف و محمد و زفر، فی الاصل لایقتل المرتد حتی یستتاب ومن قتل مرتد اقبل ان یستتاب فلا ضمان علیه

(احکام القرآن: ج۲،ص ۳۵۸)

ابو حنیفہ اور ابو یوسف اور محمد اور زفر نے فرمایا اصل میں مرتد کو قتل نہیں کیا جاتا یہاں تک کے اس سے توبہ طلب کی اور جس نے مرتد کو قتل کر دیا قبل اس کے کہ اس سے توبہ طلب کی جائے تو اس پر تاوان نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ مباح الدم شخص کو قاضی یا امام سے سبقت لے کر قتل کرنے میں کراہت تنزیہی پائی جاتی ہے لیکن قاتل پر کوئی سزا نہیں اور نہ ہی قصاص و دیت۔ چاہے وہ ارتکاب سبّ و شتم پر مباح الدم ہوا ہو یا نقض عہد کی وجہ سے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی قانون میں بھی اشتعال کی کیفیت میں قتل کرنے والے کو سزائے موت نہیں دی جاتی جبکہ اپنی ذات یا جائیداد یا اہل و عیال اور پیاروں کے تحفظ کی غرض سے بھی اگر کوئی شخص حملہ آور کو قتل کرتا ہے تو اس پر کوئی قصاص یا دیت نہیں ہوتی اور مقتول کا خون رائیگاں تصور ہوتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ شاتم رسول کو ماورائے عدالت قتل کرنے والے کا ہے۔ ہاں اسے عدالت میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس نے واقعتاً ایک شاتم کو قتل کیا تھا، ورنہ دوسری صورت [illegible] سے نہیں بچ سکے گا۔

جہاں تک سزا کے نفاذ کے اختیار کا تعلق ہے تو اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں کہ کسی مجرم پر سزا کے نفاذ یا کسی حد کے اجرا کا اختیار ریاستی اداروں کو حاصل ہوتا ہے۔

انہوں نے جو بھی دلائل یہ بات ثابت کرنے کے لئے دیئے ہیں ان سے کسی کو اختلاف نہیں ہے لیکن یہ بات بڑی عجیب محسوس ہوتی ہے کہ انہوں نے یہاں اصل مسئلہ سے صرف نظر کر کے سارا زور وہ بات ثابت کرنے پر صرف کر دیا جس پر پوری اُمت میں سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو جبکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شاتم کو از خود سزا دیتے ہوئے قتل کر دیتا ہے تو کیا اس کو قصاصاً سزا دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ جسطرح سزا کے نفاذ کے اختیار کا مسئلہ ائمہ مجتہدین اور فقہائے کرام نے کھل کر بیان کیا ہے اسی طرح یہ مسئلہ بھی انہوں نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شاتم یا مباح الدم شخص کو قاضی یا امام سے سبقت لے کر قتل کرنے والے پر کوئی قصاص یا دیت نہیں۔

ہم نے ائمہ مجتہدین کا مؤقف شرح وبسط کے ساتھ قلمبند کر دیا ہے۔ انہوں نے قتل غیرت کے حوالے سے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک قول نقل کیا ہے پھر امام شافعی کا اس قول کی متابعت اختیار کرنا بھی بیان کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قتل غیرت کی صورت میں اگر قاتل ارتکاب زنا پر چار گواہیاں پیش کر دیتا ہے تو اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ بعینہ یہاں بھی وہی معاملہ ہے اگر کوئی شخص کسی شاتم کو از خود اقدام کر کے قتل کر دیتا ہے اور وہ عدالت میں گواہوں کے ذریعے یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ مقتول نے کلمات شتم کہے تھے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جا سکے گی۔ عدم ثبوت جرم کی صورت میں البتہ اسے سزا دی جا سکے گی۔

شاتم کو ماورائے عدالت قتل کرنے کے حوالے سے معاشرتی تقسیم

﴿ مشعال قتل کے بعد موضوع سے مناسبت رکھنے والی اس عاجز کی ایک تحریر جو سوشل میڈیا پر کافی مقبول ہوئی۔ اسے بھی کتاب ہذا میں شامل کر دیا گیا ہے ﴾

شاتم کو قتل کرنے کے حوالے سے معاشرتی تقسیم

اگر چہ مشعال کیس انکوائری کی رپورٹ آنا باقی ہے لیکن اب تک کے ہوشربا انکشافات نے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اتنے ادنیٰ اور اسفل مفادات کی خاطر ہم رحمت عالم ﷺ کی ناموس کا سودا بھی کر سکتے ہیں، مجھے اس زوال پذیر معاشرے سے قطعاً یہ اُمید نہ تھی۔ کسی کے کفر و الحاد اختیار کرنے، حتیٰ کہ ناموس رسالت کا ارتکاب کرنے سے بھی بڑا جرم یہ ہے کہ ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے ناموس رسالت کے نام پر سازش کا جال بنا جائے اور ایک معصوم الدم شخص کی جان لے لی جائے اور مشہور کر دیا جائے کہ مقتول گستاخ رسول تھا۔

ایسا شخص یا گروہ ہرگز قابل معافی نہیں ہے اور عبرت ناک سزا کا مستحق ہے کیونکہ اس پر صرف ایک معصوم الدم مسلمان کا خون بہانے کا ہی جرم نہیں بلکہ ناموس رسالت کے نام پر سازش کرنے، توہین رسالت کی تہمت لگانے اور لوگوں میں منصوبہ بندی سے اس تہمت کی عام تشہیر کرنے کا الزام بھی ہے۔ اس سے سازش کرنے والے گروہ کی منافقت بھی عیاں ہوتی ہے۔ منافقین کے اُخروی انجام کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ'' (منافقین جہنم کے سب سے نیچے والے طبقات میں ہونگے)

(سورۃ النساء: ۱۴۵)

میرے خیال میں بڑے اور مرکزی مجرم وہ ہیں جنہوں نے اس سازش کا منصوبہ بنایا اور جنہوں نے ان کی اعانت کرتے ہوئے ان کی اس منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنایا۔

یہ علمی نکات کہ احناف کے ہاں شاتم کی توبہ مقبول ہے یا نہیں اور مذاہب ثلاثہ میں اس حوالے سے کیا صورت حال ہے، اور یہ کہ توہین رسالت کی سزا بطور حد ہے یا تعزیر، یا مروجہ قانون میں اس کی سزا موت نہیں بلکہ کوئی کم تر سزا ہونی چاہیے ان پر غور وفکر کی ضرورت تو تب ہو اگر اس قانون کے تحت دھڑا دھڑ سزائیں ہو رہی ہوں لیکن دوسری طرف صورت حال یہ ہے کہ آج تک کسی بھی ملزم کو اس قانون کے تحت سزا نہیں دی گئی جبکہ ہزار سے زائد لوگوں کے خلاف مقدمات درج کیے گئے۔ کئی بااثر ملزمان چھوٹ گئے، کئی لوگوں کے خلاف ثبوت نہ مل سکے اور کئی اپنی اپیلوں کی سماعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس صورت حال نے عدالتوں پر اعتماد ختم کر دیا ہے اور لوگ ماورائے عدالت اقدام کو ترجیح دینے لگے ہیں۔

بڑے اہتمام کے ساتھ غازی ممتاز قادری کو سزائے موت دی گئی تو یہ خیال کیا جانے لگا کہ ماورائے عدالت اقدامات رک جائیں گے لیکن عملاً ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ اس کی وجوہ کیا ہیں ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی وجہ قانون پر عمل درآمد کا فقدان ہے تو اس کا ازالہ ہونا چاہیے۔ اگر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ علماء معاشرے کو ماورائے عدالت اقدام پر اکسا رہے ہیں تو اس کا بھی سدباب ہونا چاہیے۔ اگر اس کا

سبب یہ نظر آرہا ہے کہ ہمارے سیاستدانوں نے عوام کو احتجاجوں اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی تربیت دی ہے تو ان کو بھی ہوش کے ناخن لینے ہونگے۔

جب حصول اقتدار بلکہ اس سے بھی چھوٹے مقاصد کے حصول کے لیے لوگوں کو قانون کے سامنے کھڑا کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور ان میں اشتعال پیدا کیا جاتا ہے تو ہم یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں ان کا ریموٹ کنٹرول ہمارے ہاتھ میں ہی رہے گا لیکن یہ ہماری خام خیالی ہے۔لوگ ہمارے پابند نہیں رہتے بلکہ وہ قانون شکنی کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں۔آج وزیراعظم (میاں نواز شریف) بلوؤں کے خلاف گرج برس رہے ہیں لیکن عدلیہ پر اپنے ورکرز کے ذریعے حملہ کروانے کی ابتدا انہوں نے ہی نہیں کی تھی؟ سابقہ چیف جسٹس کی بحالی کے لیے عوام کو کون سڑکوں پر لایا تھا اور پارلیمنٹ پر قبضے کے لیے مارچ کس نے کیا تھا؟

ان کی دیکھا دیکھی عمران خان اور ڈاکٹر طاہر القادری نے کیا دھرنہ کلچر کو فروغ نہیں دیا؟ کیا عمران خان نے اسلام آباد کو سیل کرنے کا پلان نہیں بنایا تھا؟ پاکستان ٹیلیویژن اور پارلیمنٹ پر قبضہ اور اس کے اعلانات کس نے کیے تھے؟ ماڈل ٹاؤن کے شہداء کو قانون کے سامنے سینہ سپر ہونے کا کس نے حکم دیا تھا؟ اب ایک طالب علم کے قتل پر درد بھرے ٹویٹ صرف ہماری منافقت کو آشکار کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔

اس وقت اصل مسئلہ یہ نہیں کہ قانون تحفظ ناموس رسالت میں کوئی خامی ہے بلکہ اصل علمی مسئلہ یہ ہے کہ ایک قانون کے ہوتے ہوئے کیا کسی کو توہین رسالت کے الزام پر کسی دوسرے شخص کو قتل کرنے کی اجازت ہے؟ اس کا سیدھا سا اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ اس کی اجازت نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اجازت ہی دینا مقصود ہوتا تو قانون تحفظ ناموس رسالت بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اس کے ساتھ ایک سوال اور جڑا ہوا ہے کہ اس عدم اجازت کے باوجود اگر کوئی اشتعال میں آ کر از خود اقدام کر کے کسی ایسے شخص کو قتل کر دیتا ہے جسے وہ توہین رسالت کا مرتکب سمجھتا ہے تو اس کے بارے میں اسلام کے احکام اور قوانین کیا ہیں؟

اصل میں اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت ہے کیونکہ معاشرہ اس سوال کا جواب نہ دینے کی وجہ سے تقسیم ہو رہا ہے نہ کہ تحفظ ناموس رسالت کے قانون کی وجہ سے۔ میری کوشش یہ ہوگی کہ آئندہ سطور میں اس اصل موضوع کے حوالے سے سادہ انداز میں بات کروں تاکہ یہ مسئلہ واضح ہو سکے۔

جو شخص کسی دوسرے پر توہین رسالت کا الزام لگا کر اسے قتل کر دیتا ہے اور اسے سزا دلوانے کے حوالے سے قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا اس کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟ اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ان روایات پر بات کرتے ہیں جو براہ راست اس مسئلہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔

اس سلسلہ میں بالعموم پانچ روایات پر انحصار کیا جاتا ہے۔پہلی روایت میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس منافق یعنی بظاہر مسلمان کے قتل کرنے کا ذکر ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس کی تھی اور اپنا قضیہ نئے فیصلے کے لیے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پیش کیا تھا۔

دوسری روایت میں نابینا صحابی کے اپنی اُم ولد کو قتل کرنے کا بیان ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کو بُرا بھلا کہتی تھی۔ایک دن نابینا صحابی نے اسے قتل کردیا۔

تیسری روایت میں حضرت عمیر بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کے اپنی مشرکہ اور ساب یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بُرا بھلا کہنے والی بہن کو قتل کرنے کا ذکر ہے۔

چوتھی روایت میں ایک اور نابینا صحابی حضرت عمیر بن عدی رضی اللہ عنہ کا قبیلہ خطمیہ کی یہودیہ عصماء بنت مروان کو قتل کرنے کا بیان ہے۔ یہ یہودیہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخیاں کرتی تھی۔

پانچویں روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں ایک یہودیہ شاتمہ کو قتل کرنے کا ذکر ہے۔

ان روایات پر مزید بات کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دیتا ہوں کہ یہ وہ روایات ہیں جو پیش نظر مسئلہ پر براہ راست روشنی ڈالتی ہیں۔ان روایات کا ذکر یہاں نہیں کیا جارہا جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض شاتمین کو قتل کرنے کا حکم براہِ راست دیا۔جیسے ابورافع ابن خطل اور کعب بن اشرف کا قتل،اسی طرح وہ روایات بھی یہاں

نقل کی جا رہی ہیں جن میں جید صحابہ کرام علیہم الرضوان نے حضور ﷺ سے بعض شاتمین کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عبداللہ بن اُبی کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرنا وغیرہ۔

ثانیاً یہ کہ ان میں سے پہلی روایت کی استنادی حیثیت پر قیل وقال موجود ہے، از روئے درایت بھی اس پر کچھ اعتراضات وارد کیے گئے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے میں یہاں اس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتا (اب یہ بحث تمام وکمال کتاب ہذا کی ابتدا ہی میں شامل ہے بلکہ کتاب ہذا کا نام بھی اس روایت کے حوالے سے رکھا گیا ہے) بس اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ وہ تمام اعتراضات بے بنیاد ہیں۔(ان کا تفصیلی تذکرہ اس کتاب کے ابتدائی حصے میں موجود ہے)

ثالثاً باقی چاروں روایات غیر مسلم شاتموں سے متعلق ہیں لیکن میں ان پر یہاں غیر مسلم شاتمین کے جواز قتل کے حوالے سے بات نہیں کروں گا اور نہ ہی فقہائے احناف کے اس حوالے سے باہمی اختلافات میرے زیر نظر کام سے متعلق ہیں۔

اب ان روایات پر بات کرتے ہیں۔ان پانچوں روایات سے کچھ باتیں بالکل واضح ہیں:

۱۔ان میں شاتموں کو از خود اقدام کرتے ہوئے قتل کرنے کا بیان ہے۔

۲۔قتل کرنے والوں نے اپنے اقدام سے پہلے کسی سے بات کرنا یا اجازت لینا ضروری نہ سمجھا نہ فتویٰ کے اعتبار سے اور نہ ہی قضا کے اعتبار سے اور ان میں جید صحابہ کرام علیہم الرضوان شامل ہیں۔

۳۔ پانچوں واقعات میں حضور ﷺ نے مقتولوں کے خون کو رائیگاں قرار دیدیا اور انہیں قتل کرنے والوں سے نہ قصاص کا مطالبہ فرمایا اور نہ ہی دیت کا۔

۴۔ پانچوں معاملات میں حضور ﷺ نے نہ تو کسی مارنے والے کو تعزیری سزا دی اور نہ ہی تنبیہ تک فرمائی۔

۵۔ حضرت عمیر بن عدی رضی اللہ عنہ والے معاملے میں تو الٹا ان کی تحسین فرمائی اور ان کے اس اقدام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پشت پیچھے مدد قرار دیا۔ اور فرمایا کہ یہی تو بصارت والا ہے۔

۶۔ پانچوں روایات میں سبب قتل حضور ﷺ پر کیا جانے والا سب وشتم بنا اور قتل کرنے والوں نے اعتراف قتل کیا، لہذا قتل کے ارتکاب پر کسی قسم کی شہادت کی ضرورت نہ رہی۔

۷۔ پانچوں روایات میں حضور ﷺ نے اس بات کی تصدیق کے لیے کوئی شہادت طلب نہ فرمائی کہ کیا مقتولین نے توہین کا ارتکاب کیا تھا یا یہ ان پر محض الزام تھا؟ ہاں پہلی روایت میں اتنا ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منافق کا سر قلم کرنے سے قبل فریق ثانی سے یہ تصدیق چاہی تھی کہ کیا واقعتاً حضور ﷺ نے اس کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا تھا۔ گویا جسے انہوں نے گستاخی پر محمول فرمایا اس کی تصدیق اپنے تئیں کر لی لیکن یہ بات واضح ہے کہ حضور ﷺ نے اس پر گواہی طلب نہ فرمائی اور نہ ہی قصاص کا مطالبہ کرنے والوں نے ارتکاب اہانت پر کسی گواہی کا مطالبہ کیا۔

۸۔اس سے بظاہر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے قتل کرنے والے صحابہ کی بات پر اعتماد کیا اور مقتولوں کی طرف سے کی جانے والی توہین وتنقیص پر کوئی شہادت طلب نہ فرمائی۔ اگر یہ بات درست مان لی جائے تو حضور ﷺ کی عدل گستری پر ایسا الزام آتا ہے کہ انسان کے عقیدے کی بنیاد ہی متزلزل ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی یہ توجیہ کی جائے کہ وہ معاشرہ سچائی پر قائم تھا اس لیے جو کچھ بھی کوئی بیان کرتا اسے درست مان لیا جاتا تو یہ بات کافی حد تک درست ہونے کے باوجود خلاف واقعہ اور خلاف نقل وعقل ہے کہ قتل کرنے والا جو سبب قتل بیان کر رہا ہے اسے ہی درست مان لیا جائے اور اسی بنا پر مقتول کے خون کو رائیگاں قرار دے دیا جائے بھلے وہ معاشرہ سچائی پر ہی قائم کیوں نہ ہو۔

۹۔اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہیں تو پھر ارتکاب توہین پر گواہیاں طلب کیے بغیر مقتولوں کے اہدار دم کے فیصلے فرمانے کی کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

اس کا سبب صرف یہی نظر آتا ہے کہ حضور ﷺ نے وحیٔ الٰہی کی تائید سے یہ فیصلے فرمائے جبکہ ماورائے عدالت قتل کرنے والوں نے اپنے اقدام کا اعتراف کر لیا۔ آپ دلیل پوچھیں گے تو میں عرض کیے دیتا ہوں کہ یہ قرینہ خود دو روایات کے متون میں موجود ہے۔ پہلی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ والی روایت جس میں حضور ﷺ کو وحی کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ عمر رضی اللہ عنہ نے کفر اور اسلام کے درمیان فرق کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا نام فاروق رکھا ہے۔

دوسری روایت حضرت عمیر بن عدی رضی اللہ عنہ والی ہے۔ انہوں نے منت مانی تھی کہ جب حضور ﷺ خیریت کے ساتھ بدر سے مدینہ پہنچ جائیں گے تو وہ شاتمہ عصماء بنت مروان کو قتل کر دیں گے لیکن یہ بات انہوں نے حضور ﷺ سمیت کسی کو بتائی نہیں تھی۔ چنانچہ جب انہوں نے اس شاتمہ کو قتل کیا تو مدینہ منورہ پہنچے اور مسجد نبوی شریف میں فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ نماز کے بعد حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تو نے بنت مروان کو قتل کر ڈالا ہے؟ یہ سن کر وہ گھبرا گئے اور بے ساختہ پوچھنے لگے کہ کیا اس قتل کی وجہ سے مجھ پر کوئی (سزا) ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس معاملے میں تو دو بکریوں کے سینگ بھی نہیں ٹکرائیں گے۔ یہ عربی محاورہ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ کو وحی کے ذریعے بنت مروان کے قتل سے مطلع کیا گیا اور آپ نے حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کے اقدام کی توثیق فرما دی۔ یہاں بھی کوئی گواہی نہ طلب کی گئی کیونکہ وحیِ الٰہی کے ذریعے حضور ﷺ کو مطلع کر دیا گیا۔ نابینا صحابی اور حضرت عمیر بن امیہ والی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں نے بارگاہ نبوت میں ارتکاب قتل کا اعتراف کیا تھا اور سبب قتل مقتولوں کے سب و شتم کو قرار دیا تھا۔

قارئین کرام! یہاں سے ان روایات کے فہم کے حوالے سے اُمت میں اختلاف کا معاملہ شروع کرتے ہیں جو اس مسئلہ پر چھوٹے بڑے تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

پہلی قسم میں وہ اہل علم شامل ہیں جنہوں نے ان روایات سے یہ سمجھ لیا کہ شاتم کو ازخود اقدام کرتے ہوئے قتل کرنے کا اختیار اُمت کے ہر فرد کو مل گیا ہے اور جو بھی کسی شاتم کو قتل کرڈالے اس پر کوئی قصاص و دیت نہیں اور نہ ہی اس سے مواخذہ کیا جانا چاہیے۔ نہ توہین ثابت کرنے کے لیے گواہیوں کی ضرورت ہے اور نہ ہی ثبوتوں کی بلکہ قاتل کے بیان پر ہی اس کی بریت کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ ان کا سوئے فہم یہ ہے کہ انہوں نے ان روایات سے یہ سمجھا کہ چونکہ حضور ﷺ نے اس مسئلہ پر گواہیاں طلب نہ فرمائیں اس لیے اب بھی ان کی ضرورت نہیں حالانکہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ حضور ﷺ کو تو بذریعہ وحیٔ الٰہی مطلع کر دیا جاتا تھا۔ اب حضور ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما نہیں اور فیصلے ہم نے کرنے ہیں تو ہمیں شریعت کی روشنی میں اس کا کوئی معقول حل تلاش کرنا چاہیے کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے بالخصوص اس زوال پذیر معاشرے میں جہاں سچائی مفقود ہو کر رہ گئی ہے اور جدید عمرانی اقدار نے قانون کی عملداری کے حوالے سے ایسے تصورات پیش کر دیئے ہیں جن کی بنیاد وحی یا علوم شریعت نہیں بلکہ انسان کے اپنے ذہن کی اختراعات ہیں جو بہر حال بادی النظر میں پر کشش دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ جدید ذہن جو اسلامی تعلیمات سے نابلد ہے وہ ان اقدار کا دامن ہر حال میں تھامنا چاہتا ہے خواہ درجنوں شرعی اُصول قربان کرنے پڑ جائیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے اس سے 180 ڈگری مختلف موقف اختیار کیا ہے۔انہوں نے ردعمل میں یہ موقف اختیار کیا کہ کسی کو بہرصورت کسی کی جان لینے کا حق سرے سے ہی نہیں ہے۔وہ جوش خطابت میں یہاں تک چلے گئے کہ اشتعال کا عمومی فائدہ جو مروجہ قانون کے تحت ہر قاتل کو دیا جاتا ہے اس سے بھی شاتم کے قاتل کو محروم رکھنے کے موقف پر ڈٹ گئے۔انہوں نے ان روایات کی دوراز کار تاویلات کے انبار لگا دیئے اور یقین مانیں سب کی سب سطحی۔ان کے نزدیک توہین ثابت ہو جانے پر بھی شاتم کے قاتل کی سزا موت ٹھہری خواہ ان سے مذکورہ روایات کا انکار ہی لازم آجائے۔

واضح رہے کہ شاتم کا خون رائیگاں ہونا اور اس کے قاتل کا قصاص یا دیت سے بری ہونا حضور ﷺ کے متعدد اور متواتر فیصلوں سے اظہر من الشمس ہے۔زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے تو وحی کے ذریعے خبر پائی کہ ارتکاب توہین ہوئی ہے لیکن آج کا قاضی کیا کرے؟انہوں نے اس تحقیق وتفتیش کا راستہ بند کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ شاتم کا قاتل بہرصورت لائق گردن زنی ہے۔ اس کے بعد معاشرہ واضح طور پر تقسیم ہو چکا ہے۔اور ہر گروہ کے متعلقین کو جو سبق پڑھا دیا گیا ہے وہ اس کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔کوئی سننے کے لیے تیار نہیں، تدبر اور غور وفکر تو دور کی بات ہے۔

اب فرمائیں اُمت کے پاس کیا راستہ ہے؟ پہلا یا دوسرا؟ یا کوئی تیسرا راستہ ؟ پہلے راستے پر چلیں تو اندیشہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ دین سے بیزار ہو جائے گا۔ دوسرے راستے پر چلیں تو بھی اسلام کا دامن چھوٹ جاتا ہے، اب بتائیں کونسا راستہ اختیار کیا جائے ؟ پہلا یا دوسرا یا کوئی تیسرا؟ بلاشبہ تیسرا راستہ ہے اور وہی راستہ ہی متوازن اور راست ہے جس پر چل کر اسلام کا دامن بھی تھاما جا سکتا ہے اور عدل وانصاف کے تقاضے بھی پورے کیے جاسکتے ہیں۔

وہ تیسرا راستہ یہ ہے کہ علماء اپنے خطبوں اور تقریر وتحریر میں کسی کو بھی ماورائے عدالت قتل کی ترغیب نہ دیں نہ ہی ایسے نعرے لگائیں کہ جن سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی کی توہین کا معاملہ ان کے سامنے لایا جائے اور انہیں پورا یقین ہو کہ گستاخی بنتی ہے تو وہ یہی تلقین کریں کہ یہ معاملہ قانون کے سپرد کر دیں بلکہ اندراج مقدمہ میں ان کے ساتھ تعاون کریں۔

اس کے باوجود اگر ایسا معاملہ سامنے آجائے کہ کسی نے کسی دوسرے کو قتل کرنے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ اس نے توہین رسالت پر یہ قتل کیا ہے تو قاتل کی بلا تحقیق حوصلہ افزائی نہ کریں الا یہ کہ مقتول کی طرف سے کی جانے والی توہین کا پختہ یقین ہو۔ اگر شاتم کو قتل کرنے کا دعویدار عدالت میں معیاری شہادتوں اور ٹھوس ثبوتوں کے ذریعے یہ ثابت نہ کر سکے کہ قاتل نے واقعتاً شاتم کو مارا تھا تو اسے قتل ناحق پر قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کے برعکس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مقتول شاتم تھا تو پھر قتل

کرنے والے کو قصاص و دیت سے تو بری کر دیا جائے لیکن قاضی یا امام (سربراہ) سے
سبقت لینے کی بناء پر مناسب تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ائمہ اربعہ بلکہ خمسہ میں سے شاتم کے قاتل
کو قاضی یا امام پر سبقت لینے کی وجہ سے تعزیری سزا دینے کا موقف صرف امام احمد بن
حنبل رحمہ اللہ کا ہے جبکہ پانچوں ائمہ مجتہدین ایسے قاتل کی قصاص و دیت سے بریت
پر متفق ہیں جس نے شاتم کو مارا ہو اور عدالت میں بھی اس کی توہین ثابت ہو جائے۔
آج کے اس دور میں لوگوں کو نظم کا پابند رکھنے کے لیے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی
رائے سے استفادہ کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ معاملہ قضا کا ہے کہ قاضی دیکھے کہ توہین ہوئی کہ نہیں۔ اگر قاضی اس
حوالے سے جان بوجھ کر ناانصافی کرے گا تو گنہ گار ہوگا اور عند اللہ اس کی پکڑ ہوگی۔
دنیا میں بھی اس کے فیصلے کے خلاف متاثرہ فریق اپیل کر سکتا ہے۔ اگر بفرض محال
قاضی اجتہادی غلطی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے
کہ جج شریعت اسلامیہ اور توہین اور اس سے متعلقہ عدالتی معاملات اور اصطلاحات
سے خوب واقف ہو۔ یہ نہ ہو کہ وہ بیٹھا تو سپریم کورٹ میں ہو اور ارتداد مغلظہ تک کا
مطلب نہ جانتا ہو۔ زیادہ موزوں ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ بڑھاتے ہوئے
اسے ان مقدمات کی سماعت کے لیے ٹرائل کورٹ کا درجہ دیدیا جائے لیکن یہ لحاظ
کیا جائے کہ شرعی عدالت کے اس بنچ میں کم از کم دو علماء جج ضرور ہوں۔

اس طرح شاتم کو ماورائے قانون قتل کرنے والے کو قصاص و دیت سے بریت کا فائدہ تبھی ہو سکے گا جب وہ عدالت میں ثابت کر سکے گا کہ اس نے شاتم کو ہی قتل کیا تھا۔ جس طرح توہین کسی صورت میں برداشت نہیں کی جا سکتی اسی طرح یہ بھی کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے کہ توہین کا جھوٹا الزام لگا کر قتل کرنے والا سزا سے بچ سکے۔

اس کے علاوہ اگر کسی دوست کے پاس کوئی ایسا راستہ ہو جس پر چلتے ہوئے ہم اسلام کے دامن سے بھی وابستہ رہیں اور معاشرہ بھی تقسیم نہ ہو تو وہ ضرور بتائے۔ میں اگر اس کے مؤقف کو درست پاؤں گا تو کم از کم مجھے اسے قبول کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوگی۔ کیونکہ ارشاد الٰہی ہے "وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيْمٌ" (ہر علم والے سے بڑھ کر علم والا ہے)

قانون تحفظ ناموس رسالت کے حوالے سے لکھی گئی متفرق تحریریں

﴿چونکہ معترضین کا اصل اعتراض مروجہ ''قانون تحفظ ناموس رسالت پر ہے اس لئے جو تحریریں اس عاجز کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس موضوع پر لکھی گئیں، انہیں بھی کتاب ہذا میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے وہ کھلا خط شامل کیا گیا ہے جو سلامت مسیح اور رحمت مسیح کی رہائی کے بعد نوے کی دہائی میں یورپی ممالک اور امریکہ کے سربراہان مملکت کے نام انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ یہ خط معہ اُردو ترجمہ عالمی دعوت اسلامیہ کی طرف سے وسیع پیمانے پر الگ شائع کیا گیا تھا۔ کتاب ہذا میں اس کا اُردو ترجمہ شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ خط تحریر کرنے کی سعادت بھی اس عاجز کو حاصل ہوئی﴾

پس منظر

گستاخیٔ رسول ﷺ کے جرم میں سزا پانے والے دو مجرم سلامت مسیح اور رحمت مسیح نے جب عدالت عالیہ میں اپیل دائر کی تو پوری یورپی برادری اور امریکہ میں ہلچل مچ گئی۔ مغربی میڈیا غیر معمولی طور پر سرگرم ہو گیا۔ مختلف ممالک سے مجرموں کو رہائی کے بعد وہاں منتقل ہونے کی پیش کش ہونے لگی۔ امریکہ اور اہل مغرب کی اس مقدمہ میں خصوصی دلچسپی کے مناظر دیکھ کر ہمارے ہاں یہ خدشہ بجا طور پر محسوس کیا جانے لگا کہ اب امریکہ اور مغربی ممالک پاکستانی حکومت پر یہ دباؤ ڈالیں گے کہ وہ تحفظ ناموس رسالت کے قانون میں تبدیلی کر ڈالیں۔ کچھ دنوں بعد واقعتاً پہلے امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے اور بعد ازاں جرمنی کے صدر نے پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے برملا اس قانون کو تبدیل کرنے کی بات کی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ پاکستانی حکومت اس مسئلہ پر اپنا موقف بیان کرتی اور امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کو قائل کرتی کہ اس سلسلہ میں ان کا اپنا نقطۂ نظر درست نہیں لیکن امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان اور جرمنی کے صدر کے اخباری بیانات سے الٹا یہ تاثر ابھرا ہے کہ ہماری حکومت نے انہیں متذکرہ قانون میں تبدیلی کے حوالے سے اطمینان بخش جواب دیا ہے۔

اندریں صورت ہم اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک مذہبی جماعت کے ادنیٰ خادموں کی حیثیت سے امریکہ اور مغربی ممالک کے سربراہوں کے سامنے اپنا تفصیلی

موقف پیش کریں۔

ہم اُمید رکھتے ہیں کہ آپ جیسے جمہوری المزاج منطقی رویوں پر یقین رکھنے والے اور انسانی حقوق کا دم بھرنے والے حضرات ہمارے موقف کو ہر قسم کی نسلی گروہی اور مذہبی عصبیتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سنیں گے اور ہماری یہ معروضات صدا بصحرا ثابت نہیں ہونگی۔

قانون سازی کے حوالے سے خارجی دباؤ غیر جمہوری ہے

اولاً ہر جمہوری ریاست قانون سازی کے حوالے سے اپنے آئین اور روایات کی پابند تو ہوتی ہے لیکن کسی قسم کا خارجی دباؤ قانون سازی سے پہلے یا بعد میں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔

خود آپ کے ہاں شراب نوشی، جوا، جنسی آزادی اور بعض ممالک میں مرد سے مرد کی شادی کے حوالے سے درجنوں ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جو نہ تو شریعت اسلامیہ سے کسی قسم کی مطابقت رکھتے ہیں اور نہ ہی اخلاقی اقدار سے میل کھاتے ہیں۔ یہ تمام قوانین آپ کے مسلمان شہریوں پر بھی یکساں طور پر لاگو ہیں لیکن کبھی کسی مسلمان ریاست نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا ہے کہ آپ ان قوانین میں ان کے حسب منشاء تبدیلیاں کر دیں۔ لہذا آپ کی طرف سے ہمارے کسی قانون میں ترمیم کی تجویز یا مطالبہ اخلاقی اور جمہوری روایات کے منافی ہونے کے باعث درست نہیں۔

یہ ایک وسیع البنیاد قانون ہے

ثانیاً توہین رسالت کا قانون ایک وسیع البنیاد قانون ہے کیونکہ انبیاء اور رُسل عظام کی

عصمت کا تحفظ کسی ایک مذہب کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ تمام مذاہب عالم کا مشترکہ مسئلہ ہے۔بائیبل میں بھی دوٹوک طور پر توہین رسالت کو نا قابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔

"لیکن پاک پیغمبر کی اہانت۔۔یہ ہرگز معاف نہیں کی جائے گی"

(Mathew.12.28)

یورپ اور امریکہ اٹھارہویں صدی تک اس معاملہ میں ہمارے ہم خیال رہے ہیں اور توہین رسالت کے مجرموں کو سنگین ترین سزائیں دیتے رہے ہیں۔ ایک پادری ڈیوڈ کو 1579 میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اہانت پر ہنگری میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

روم میں برونو کو 1600ء میں توہین رسالت کی سزا کے طور پر زندہ جلایا گیا۔ برطانیہ میں بھی 1553ء کے مذہبی قوانین کے مطابق پانچ افراد کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گستاخی پر ایلزبتھ کے دور میں زندہ جلایا گیا۔ سکاٹ لینڈ میں بھی توہین رسالت اور عیسائیت کی توہین کی سزا موت تھی۔امریکہ میں بھی 1611ء کے قوانین کے تحت توہین رسالت کی سزا موت مقرر کی گئی تھی۔اٹھارہویں صدی میں ان سزاؤں میں کمی کا رجحان تو پیدا ہوا لیکن انہیں کلیۃً ختم نہ کیا گیا۔ برطانیہ میں 1821ء اور 1834ء کے درمیانی عرصہ میں 73 مجرموں کو سزا دی گئی جبکہ امریکہ کی مختلف ریاستوں میں 1838ء تک تقریباً اسی قدر مجرموں کو توہین رسالت ومذہب پر سزائیں دی گئیں۔ 1838ء میں یکا یک امریکہ میں" کامن ویلتھ بنام لی لینڈ"

مقدمہ میں عدالت نے فیصلہ صادر کر دیا کہ مذہبی اُمور کو عدالتی اور حکومتی اُمور سے الگ رکھا جائے۔ اسی طرح 1938ء میں برطانیہ کے لارڈ چیف جسٹس نے پریس کی آزادی کو اس اہم قانون پر ترجیح دے دی اور یوں آپ کے ہاں توہین رسالت کرنے والوں کو کھلی چھٹی مل گئی۔

اس کے بعد اگر چہ 1968ء کے بعد امریکہ میں ایک بھی ایسا مقدمہ دائر نہیں ہوا لیکن حال ہی میں امریکہ میں جو ماجرا ڈیوڈ کے ساتھ پیش آیا اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں گستاخیٔ رسول کے قانون میں جو لچک دیدی گئی تھی اس کے غلط ہونے کا اندازہ تو آپ کو بخوبی ہو گیا ہے لیکن آپ اس کا اعتراف کرنے کی بجائے ایسے مجرموں کو عدالتوں سے بالا بالا ہی کیفر کردار تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی حکومت نے فوجی آپریشن کے ذریعے ڈیوڈ کا معبد جلا ڈالا جس میں اس کے علاوہ اس کے 300 ایسے ملازمین وغیرہ بھی مارے گئے جو اس کے نظریات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس نے خود بھی صرف یہی کہا تھا کہ اس کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح حلول کر گئی ہے۔

آپ خود غور فرمائیں کہ جس معاملہ پر بائبل میں واضح الہامی ہدایت موجود ہو اور صدیوں تک آپ نے اس کے تتبع میں اپنے قوانین بنائے اور جاری کیے ہوں اس کو یکایک غیر منطقی عدالتی فیصلوں کی بھینٹ چڑھا دینا کہاں کا انصاف ہے؟ جبکہ دوسری اقوام کو اپنی اس غلطی کی پیروی پر مجبور کرنا تو یقیناً اس سے بھی بڑی بے انصافی ہے۔

اس قانون کا اطلاق ہر مذہب کے مجرموں پر ہوتا ہے

ثالثاً یہ قانون کسی مخصوص مذہب کے پیروکاروں کو نشانہ بنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے ان مجرموں پر ہوتا ہے جو پیغمبر اسلام علیہ السلام کی گستاخی کا ارتکاب کریں۔ اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت بھی پاکستان میں 300 سے زائد ایسے مجرم ہیں جو مذہباً مسلمان تھے اور گستاخی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارتکاب پر زیریں عدالتوں سے موت کی سزا سننے کے بعد عدالت عالیہ میں اپنی اپیلوں کی سماعت کا موت کی کوٹھڑیوں میں انتظار کر رہے ہیں۔

انسانی حقوق کی پاسداری کا دعویٰ محل نظر ہے

رابعاً آپ کا یہ دعویٰ نا قابل فہم اور محل نظر ہے کہ آپ انسانی حقوق کا معاملہ درپیش ہونے کی وجہ سے متذکرہ قانون میں تبدیلی کی بات اُٹھا رہے ہیں کیونکہ اگر معاملہ انسانی حقوق کا ہوتا تو آپ اس وقت بھی بات کرتے جب مسلمانوں کو اس قانون کے تحت سزائیں ملتی رہیں۔ آپ دراصل انسانی حقوق کی نہیں عیسائیوں کے حقوق کی بات کر رہے ہیں اور عیسائی بھی وہ جو آپ کی رعایا نہیں۔

اسلامی ریاستوں میں یہ قانون رائج رہا ہے

خامساً مسلمان ریاستوں میں غیر مسلموں کو توہین رسالت کے جرم پر موت کی سزا دی جاتی رہی ہے جس پر آپ کے مؤرخین خود شاہد ہیں۔

رافیل آلیٹمرا لکھتے ہیں:

"عبد الرحمٰن دوم کے دور حکومت میں قرطبہ کے ایک پادری الوارو کا ایک اور

پادری ایولوجیو اور دولڑکیوں فلورا اور ماریا کے ہمراہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے کے الزام میں قرطبہ میں سر قلم کیا گیا۔"

یہ ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا اسلامی قانون کے مطابق موت تھی۔

(تاریخ ہسپانیہ)

ایک اور مصنف ٹائٹس برک ہارٹ یوں رقمطراز ہیں:

"نویں صدی کے وسط میں عبدالرحمٰن دوم کے عہد حکومت میں ایک بڑی جوابی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی جس نے "شہادت" کی بالارادہ جستجو کی شکل اختیار کر لی۔ مسلمانوں نے عیسائیت کے صاف اور سیدھے طریق عبادت میں کبھی مداخلت نہ کی تھی لیکن جب بہت سے عیسائی مرد وزن نے اسلام پر دشنام طرازی اور پیغمبر اسلام پر ملامت کا سلسلہ شروع کیا تو مسلمان قاضیوں نے انہیں موت کی سزائیں دیں۔

(مورش کلچران اسلام: ۲۶۔۲۷)

یہ قانون انسانوں کا بنایا ہوا نہیں

سادساً یہ قانون آپ کے قوانین کی طرح انسانوں کا وضع کردہ نہیں بلکہ قرآن وسنت کا عطا کردہ ہے۔ اس قانون کے کتاب وسنت سے ماخوذ ہونے پر آپ کی کتب بھی گواہ ہیں۔

"قرآن حکیم کے الفاظ میں کلمۃ الکفر توہین رسالت اور مذہب اسلام کی تحقیر کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ فقہ میں اس موضوع پر قانون موجود ہے۔"

(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجز۔ جلد دوم: ۲۴۲)

انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین عارضی ہوتے ہیں جبکہ الہامی قوانین کو نئے الہامی قوانین ہی منسوخ کر سکتے ہیں۔ اکثر رسول ایسے مبعوث ہوئے ہیں جنہیں نئی شریعتیں نہیں دی گئیں تھیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایسے ہی پیغمبران عظام میں سے ہیں۔ آپ اپنے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ خیال نہ کریں کہ میں (مروجہ) قوانین یا الہامی ہدایات کو ختم کرنے آیا ہوں میں ختم کرنے نہیں بلکہ ان کی تعمیل کے لیے آیا ہوں۔''

(بائبل میتھیو:۵)

اس کے برعکس انسانوں کے بنائے ہوئے اپنے قوانین دیرپا ثابت نہیں ہوتے جلد یا بدیر عقل انسانی پر از خود ان خود ساختہ قوانین کے اسقام اور خرابیاں آشکار ہو جاتی ہیں۔ کہاں پیرس میں پانی کی طرح شراب کے استعمال کی اجازت اور کہاں اسی سرزمین کے ڈاکٹر چارلس رچٹ (جنہیں فزیالوجی میں نوبل پرائز دیا گیا ہے) کا شرابی کے بارے میں یہ تازہ ترین تجزیہ،

''جانوروں کی کسی نوع حتی کہ سور، گیدڑ اور گدھے میں بھی یہ بے حیائی اور بے غیرتی نہیں پائی جاتی۔ شرابی بدترین مخلوق اور مکروہ وجود ہے جسے دیکھ کر اس بات پر شرم آتی ہے کہ یہ بھی بنی نوع انسان ہے۔''

اگر ڈاکٹر چارلس رچٹ کی اتباع میں روشن ضمیری اور بلند خیالی کا یہ سفر جاری رہا تو عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد فرانس کے قانون ساز اداروں کو شراب پر قانونا پابندی لگانا پڑ جائے۔ یہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بے ثباتی کی ایک

جھلک ہے۔اس کے برعکس الہامی قوانین میں نہ تو تغیر و تبدل ممکن ہے اور نہ ہی کسی قسم کا حک و اضافہ۔لہذا اس بنیاد پر بھی متذکرہ قانون میں تبدیلی کا مطالبہ ہرگز درست نہیں معلوم ہوتا۔

طریق قانون سازی میں فرق

سابعاً آپ کے اور ہمارے طریق قانون سازی میں بھی نمایاں فرق ہے۔آپ کی مقننہ پر قانون سازی کے حوالے سے صرف یہ قدغن ہوتی ہے کہ وہ آئین سے متصادم قانون سازی نہ کرے جبکہ ہمارے ہاں مقننہ پر یہ پابندی بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسی قانون سازی نہ کرے جس کا شریعت کے کسی حکم کے ساتھ ٹکراؤ ہو۔اگر کوئی ایسا قانون تشکیل پا بھی جائے تو اسے ایک عام شہری بھی وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کر سکتا ہے البتہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی جا سکتی ہے جس کی سماعت سپریم کورٹ کا شریعت اپیلٹ بنچ کرتا ہے۔

توہین رسالت کے زیر بحث قانون میں چند سال پہلے عمر قید کی متبادل سزا کی گنجائش بھی موجود تھی جس کی بناء پر اس قانون کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا گیا۔معزز عدالت نے نامور علماء اور ماہرین قانون کی تفصیلی آراء سننے کے بعد اس قانون میں عمر قید کی متبادل سزا کے الفاظ کو حذف کرنے کا فیصلہ سنایا۔

اندریں صورت اس مسئلہ کو دوبارہ پارلیمنٹ میں اُٹھانا کیا ہمارے طریق قانون سازی کے ساتھ کھلا مذاق نہیں ہوگا؟ آپ کے اور ہمارے مابین طریق قانون

سازی کے اس نمایاں فرق کا پس منظر بھی معذرت کے ساتھ عرض ہے۔

ہم ریاستی عدالتی اور جملہ دنیاوی اُمور میں شریعت اسلامیہ کی قانونی بالادستی اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری الہامی کتاب ہمیں ہر ہر مسئلے کا کامل اور تشفی حل فراہم کرتی ہے اور چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود نہ تو اس کی ہدایت کی اثر آفرینی میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ ہی اس میں کوئی لفظی و معنوی تغیر و تبدل۔

ہماری کتاب یعنی قرآن حکیم کی اس جامعیت اور تحریفات و اغلاط سے پاک ہونے پر غیر مسلم بھی شاہد ہیں۔ طوالت کے خوف سے صرف دو حوالہ جات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سروجنی نیڈو کہتے ہیں:

''عدل کا شعور اسلام کے ارفع تصورات میں سے ایک ہے چونکہ میں نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے، جس سے میں نے زندگی کے طاقتور اُصولوں کا فہم حاصل کیا ہے جو بالائے فہم نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے روزمرہ زندگی کے حوالے سے کلی ضابطۂ اخلاق کا درجہ رکھتے ہیں۔''

(Speeches and writings of serogini Naido p-167)

گبز قرآن حکیم میں کسی قسم کی تحریف یا آمیزش کے امکان کا رد کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

خوب! اگر قرآن ان (حضرت محمد ﷺ) کی ذاتی تصنیف تھی تو اور لوگ بھی اس کام میں ان کا مقابلہ کرتے۔ وہ ایسی دس آیات ہی بنا دیتے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو

پھر یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ قرآن ایک منفرد شہادتی معجزہ ہے۔

(Muhammadenism by H.A.R Gibbs p-33)

ادھر آپ کی عدالتوں نے آپ کو ریاستی وعدالتی اُمور اور مذہبی اُمور کے مابین دوئی کی راہ اس لیے بجھادی کہ آپ کی کتاب مقدس میں اس قدر اغلاط در آئی ہیں کہ اس کی ثقاہت مشکوک اور اس پر اعتبار معدوم ہو گیا ہے۔ آپ کے ہاں شائع ہونے والے میگزین "Look" کی 26 فروری 1952 کی اشاعت میں ہارٹ ذیل سپنس کا تصنیف کردہ ایک مضمون "بائبل کے متعلق صداقت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں اس فاضل مصنف نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ایک انگریز اتھارٹی کے مطابق بائبل کے عہد نامہ جدید کے دونوں ایڈیشنوں میں جو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے ہاں بالعموم پڑھے جاتے ہیں 20,000 سے زائد اغلاط موجود ہیں جبکہ بائبل کے جدید طالب علموں کے مطابق ان اغلاط کی تعداد 50,000 کے لگ بھگ ہے۔

اب تو چلتے چلتے نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ جون 1984 میں 39 میں سے 31 بشپس اس بات پر متفق ہو گئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات احیائے موتی اور کنواری عورت سے پیدائش بالکل اسی طرح رونما نہیں ہوئے تھے جس طرح بائبل میں بیان کیے گئے ہیں۔ بشپس کی اس اکثریتی رائے کے پیش نظر چرچ آف سکاٹ لینڈ نے اپنی شائع کردہ کتاب بعنوان "A statement of faith" میں سے کنواری عورت سے پیدائش والا براہ راست حوالہ ہی خارج کر دیا۔ گویا آپ کے ہاں الہامی کتب کے بھی وہی الفاظ، واقعات اور ترتیب معتبر ہوتی ہے جس پر بشپس کا اتفاق ہو۔ اس صورت حال میں چاہیے تو یہ تھا کہ آپ کے دل اس کتاب نور کی طرف

جھک جاتے جس میں چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود زیر وزبر کی کمی یا بیشی واقع نہیں ہوئی، جو آخری الہامی کتاب ہے جس کا مخاطب تمام انسانیت اور موضوع انسان کی فوز وفلاح ہے۔ جس کی اثر آفرینی کا یہ عالم ہے کہ جرمنی کے مشہور راہب نیٹشے کہا کرتے تھے کہ میں جب اس کتاب کا ترجمہ جرمنی زبان میں پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم کے اندر رقص کرتی ہے لیکن آپ نے الٹا ہمیں ہی ہمارے ان قوانین پر کوسنا شروع کر دیا جو براہ راست اس الہامی ہدایت کے عطا کردہ ہیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ الہامی قوانین کو انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر بالادستی حاصل ہوتی لیکن آپ اس کے برعکس اپنے خودساختہ قوانین ہی کو برتر اور فائق سمجھ رہے ہیں اور وہ بھی کسی ضابطے اور قاعدے کے بغیر۔

امریکہ کے ہاں مقدمات میں ملوث کوئی شخص اگر پاکستان میں ہو تو امریکہ ہماری حکومت پر دباؤ ڈال کر وہ ملزم گرفتار کر لیتا ہے۔ ادھر جو ملزمان آپ کے ہاں رہنے والے ہمیں مطلوب ہوتے ہیں، انہیں آپ ڈنکے کی چوٹ پر سیاسی پناہ دیدیتے ہیں۔

اگر امریکہ کے شہریوں کے ساتھ پاکستان میں کوئی زیادتی ہو تو آپ مجرموں کو امریکی قوانین کے مطابق سزا دینے پر مصر رہتے ہیں، ادھر پاکستان میں جرم ہو تو آپ ہمیں ہمارے مجرم شہریوں کو ہمارے قانون کے مطابق سزا نہیں دینے دیتے بلکہ الٹا اس قانون میں تبدیلی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں۔

بحالات بالا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ بھی سیکولرازم کے فریب

سے نکل کر اپنی الہامی کتاب کے مطابق توہینِ رسالت اور اہانت مذہب کی سزا اپنے اپنے ملکوں میں پھر سے بحال کر دیں تا کہ دنیا بھر میں ایسے بدبختوں سے یکساں سلوک کیا جا سکے۔

اگر پریس کی آزادی اور انسانی حقوق کے نام نہاد تصورات نے آپ کو اس قدر پابجولاں کر دیا ہے کہ آپ یہ جرأت مندانہ قدم نہیں اُٹھا سکتے تو خدارا کم از کم ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں اور ہمارے قانونی معاملات میں مداخلت کی روش کو ترک فرمائیں اور یہ فیصلہ آنے والے مؤرخ پر چھوڑ دیں کہ آپ نے اس الہامی قانون کو چھوڑ کر کیا کھویا اور ہم نے اسے سینے سے لگا کر کیا پایا؟

اللہ رب العزت ہم سب کو سیدھے راستے کی ہدایت فرمائے، ان لوگوں کا راستہ جن پر اس کا انعام ہوا نہ کہ ان لوگوں کا جن پر اس کا غضب ہوا اور وہ راستے سے بھٹک گئے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ماہنامہ سوئے حجاز کے اداریہ جات

﴿اس حصے میں ماہنامہ سوئے حجاز کے وہ اداریہ جات شامل کیے جارہے ہیں جو اس عاجز نے وقتاً فوقتاً قانون تحفظ ناموس رسالت کے دفاع کی غرض سے تحریر کیے﴾

جنوری، فروری 2001

قانون تحفظ ناموس رسالت کے خلاف سازشیں۔۔۔آخر کب تک؟

چند ماہ قبل فوجی حکومت کے بعض حکام کی طرف سے یہ عندیہ دیا گیا کہ حکومت قانون تحفظ ناموس رسالت 295/c میں ترمیم کا فیصلہ کر رہی ہے۔ بعد ازاں یہ وضاحت کی گئی کہ قانون میں ترمیم نہیں بلکہ اس قانون کے تحت مقدمہ کے اندراج کے طریق کار میں تبدیلی لائی جا رہی ہے لیکن مذہبی جماعتیں اس وضاحت پر مطمئن نہ ہوئیں اور بجا طور پر انہوں نے مقدمہ کے اندراج کے طریق کار میں مجوزہ تبدیلی کو اس اہم قانون کو غیر مؤثر بنانے کی ایک درپردہ کوشش قرار دیا۔ دینی حمیت سے سرشار علمائے کرام نے اس حکومتی اقدام کے خلاف زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا جبکہ حکومت نے اس احتجاج کو ناکام بنانے کیلئے کاروان اسلام کے مرکزی امیر حضرت مولانا مفتی محمد خان قادری سمیت متعدد علمائے کرام کو جیلوں میں بند کر دیا لیکن ذاتی اغراض اور نام ونمود سے بالاتر ہو کر چلائی جانے والی یہ تحریک تحفظ ناموس رسالت زور پکڑتی چلی گئی چنانچہ صورتحال کی سنگینی کے پیش نظر چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف کو خود ایک پرہجوم پریس کانفرس میں دوٹوک اعلان کرنا پڑا کہ حکومت توہین رسالت ایکٹ کے تحت مقدمہ کے اندراج کے سابقہ طریق کار ہی کو بحال رکھے گی۔

حال ہی میں انجمن سرفروشان اسلام کے کارکنان اور یوسف کذاب کے

حواریوں نے بعض دیگر افراد سے مل کر احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ان کا مطالبہ ہے کہ 295/c کے تحت مقدمہ کے اندراج کے طریق کار کو تبدیل کیا جائے۔ان کے اس مطالبے کی وجہ تو صاف ظاہر ہے کیونکہ اس قانون کے تحت پہلے یوسف کذاب کو اور پھر انجمن سرفروشان اسلام کے سربراہ ریاض احمد گوہر شاہی کو سزا دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ان دونوں افراد کے حواریوں کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے مطالبات کرنے کی بجائے اپنے قائدین کی صفائی کیلئے قانونی جنگ لڑیں۔کیونکہ ابھی تو ٹرائل کورٹ کے فیصلے سامنے آئے ہیں۔اگر بالائی عدالتیں انہیں بے گناہ ثابت کرتی ہیں تو سجدہ شکر بجالائیں۔اس کے برعکس اگر وہ قصوروار ٹھہرتے ہیں تو ایسے قائدین سے برأت کا اعلان کریں اور ان کے ساتھ اپنی محبتوں اور وفاداریوں کو ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کردیں اور فی الحال اتنا تو ضرور کریں کہ اس قانون کو غیر مؤثر بنانے کی کوششوں کے جرم میں کسی طور بھی شریک نہ ہوں۔ایسے لغو مطالبے سے ان کے قائدین کو فائدہ پہنچنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ان پر پہلے ہی مقدمات قائم ہو چکے ہیں البتہ ان کی رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستگی کمزور ہونے کا پورا احتمال ہے۔

ویسے بھی یہ مطالبہ سراسر غیر منطقی ہے جب ملک میں نافذ دیگر تمام قوانین کے تحت مقدمہ درج کرنے اور کرانے کا ایک ہی طریق کار موجود ہے تو اس قانون کے ساتھ یہ بلاجواز امتیاز کیوں؟

مزید برآں کسی بھی قانون کے تحت جھوٹا مقدمہ درج کرانے کی صورت میں جھوٹے مدعی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی گنجائش موجود ہے۔اسی گنجائش کا اطلاق قانون تحفظ ناموس

اسی طرح اس احتیاط کے باوجود دیگر قوانین کے تحت جھوٹے مقدمات درج ہوتے رہے ہیں بلکہ کئی بے گناہوں کو سزائیں بھی ملتی رہی ہیں لیکن ہمارا یہ ردعمل کبھی نہیں سامنے آیا کہ ہم ان قوانین کو ختم کرنے یا ان کے تحت مقدمات درج کرنے کے طریق کار میں تبدیلی کیلئے احتجاجی مظاہرے کرنے لگیں۔ لہٰذا اگر ہم اس اہم قانون کو دیگر قوانین کے برابر بھی سمجھیں تو ہمیں یہ طرز عمل ہرگز زیب نہیں دیتا حالانکہ ہمیں چاہیے کہ ہم اس قانون کو دیگر تمام قوانین سے اہم تر اور مقدم سمجھیں اور اس کی تنفیذ اور بالادستی کے رستے میں حائل ہر رکاوٹ کو دور کرنے کیلئے عملی جدوجہد کریں۔

عیسائی برادری پہلے یہ شور مچاتی تھی کہ یہ قانون صرف عیسائیوں کو انتقامی کاروائی کا نشانہ بنانے کیلئے وضع کیا گیا ہے یوسف کذاب اور گوہر شاہی کو اس قانون کے تحت سزا ملنے کے بعد انہیں ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچنا چاہیے کہ یہ ایک وسیع البنیاد قانون ہے جس کا اطلاق ہر مذہب کے پیروکار پر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ قانون کتاب وسنت کی رو سے صرف پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی گستاخی ہی پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی پیغمبر کی اہانت کا مرتکب اس قانون کی زد میں آجاتا ہے۔ (مروجہ قانون میں بوجوہ ایسا نہیں ہے) ان حضرات کیلئے بھی درست تر روش یہی ہے کہ وہ یوسف کذاب اور گوہر شاہی کے پیروکاروں کے ساتھ مل کر احتجاجی مظاہروں سے دستبردار ہو جائیں تاکہ ان کا نام کسی بھی مذہب کے ان بدبخت افراد میں شامل نہ ہو جو پاک پیغمبروں کی اہانت جیسا ناقابل معافی جرم کرنے کی جسارت کرتے ہیں یا یہ

دسمبر 2010ء

تحفظ ناموس رسالت کے قانون کو برقرار رکھا جائے

پاکستان کی عدالتیں جب بھی کسی غیر مسلم کو تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے تحت سزا کا حکم سناتی ہیں تو مغربی ممالک نہ صرف اسے اس سزا سے بچانے کے لیے متحرک ہو جاتے ہیں بلکہ اس قانون کے خاتمے کے لیے بھی ہمارے حکمرانوں پر دباؤ بڑھا دیتے ہیں۔ ادھر کچھ روشن خیال شخصیات جو اپنے آپ کو پاکستان میں انسانی حقوق کا علم برادر تصور کرتی ہیں وہ بھی ان کی ہم نوا بن جاتی ہیں۔

چنانچہ اس دفعہ بھی جب پاکستان کی ایک عدالت نے توہین رسالت کی ایک غیر مسلم ملزمہ آسیہ بی بی کو سزا کا حکم سنایا تو وہی پرانا کھیل دوبارہ شروع کر دیا گیا۔ صدر آصف علی زرداری پر بیرونی دباؤ کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گورنر پنجاب سلیمان تاثیر کو آسیہ بی بی کی دادرسی کے لیے جیل میں بھیجا اور انہوں نے آسیہ بی بی کو ساتھ بٹھا کر پریس کانفرنس منعقد کی اور واضح کیا کہ صدر آصف علی زرداری اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے آسیہ بی بی کی سزا معاف کر دیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آسیہ بی بی بے گناہ ہے اور اسے غلط طور پر اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ گورنر پنجاب کے اس اقدام کے بعد لبرل اور نام نہاد روشن خیال حضرات پھر سے قانون تحفظ ناموس رسالت کو ختم کرنے کے لیے چیخنے اور چلانے لگے ہیں۔

جہاں تک آسیہ بی بی کا معاملہ ہے تو اسے سزا ایک عدالت کی طرف سے دی گئی ہے اگر وہ اس عدالتی فیصلے سے ناخوش ہے تو وہ بالائی عدالتوں میں اپیل کا حق محفوظ رکھتی ہے۔ تحفظ ناموس رسالت کے قانون کے خاتمے کے لیے چیخنے اور چلانے والے یہ عناصر اسے بالائی عدالتوں سے انصاف دلانے کے لیے اس کی قانونی مدد کر سکتے ہیں اور اس کا مقدمہ لڑنے کے لیے بڑے سے بڑا وکیل بھی کھڑا کر سکتے ہیں لیکن خدا جانے عدلیہ کی بالا دستی اور قانون کی حکمرانی کے طلبگار یہ حضرات اس مقدمہ میں قانونی راستہ اختیار کرنے سے کیوں گریز پا ہیں؟ جب آسیہ بی بی کے پاس بالائی عدالتوں میں اپیل کرنے کا حق موجود ہے تو اس پر انحصار کرنے کی بجائے صدر سے رحم کی اپیل کیوں کی جا رہی ہے؟ (حالانکہ اصولاً اور قانوناً آخری عدالت یعنی سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلے کے بعد ہی صدر سے اپیل کی جا سکتی ہے) درست ہے کہ آئین پاکستان کے تحت صدر کو کسی بھی مجرم کی سزا معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے اگرچہ صدر کو یہ اختیار فراہم کرنے والی آئینی شق حدود کی حد تک اسلام کے منافی ہے اور اس بنا پر اسے ختم کر دینا چاہیے اور سب سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ یہ اختیار تب بروئے کار لایا جا سکتا ہے جب آخری عدالت یعنی سپریم کورٹ بھی ملزم کو دی جانے والی سزا کو برقرار رکھے۔ یہ جناب صدر کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اس اختیار کو استعمال کر کے اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرتے ہیں یا ایک ایسی مجرمہ کی سزا برقرار رکھتے ہیں (یعنی یہ معاملہ عدالتوں کے سپرد ہی رہنے دیتے ہیں) جس نے اس ہستی کے لیے اہانت آمیز کلمات استعمال کیے ہیں جن سے کل روز قیامت جناب صدر کو بھی شفاعت کی اُمید ہے۔

بقول اقبال رحمہ اللہ

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم؟

البتہ جن لوگوں نے اس قانون کو منسوخ کروانے کے لیے آواز اُٹھائی ہے ان کی گمراہ کن سوچوں کو مسترد کرنے کے لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ قانون ایک وسیع البنیاد قانون ہے اور اس کا اطلاق ہر مجرم پر ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہ تاثر ہرگز درست نہیں کہ یہ قانون صرف مسیحی برادری اور دیگر اقلیتوں کے لیے بنایا گیا ہے اگر ایسا معاملہ ہوتا تو مسلمانوں کے خلاف اس قانون کے تحت مقدمات کیوں درج کیے جاتے؟

یہ بات بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اس قانون کا تعلق اقلیتوں کے حقوق کے ساتھ ہے۔ اسلام سے بڑھ کر اقلیتوں کے حقوق کا ضامن کوئی مذہب یا عمرانی فلسفہ نہیں ہوسکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ذمی (معاہد) کی جان اور مال کی حرمت میری جان اور مال کی حرمت کی طرح ہے۔ ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکتا جس نے اسلامی ریاست میں رہنے والے کسی غیر مسلم کو ناحق قتل کیا۔ اس سے بڑھ کر اقلیتوں کے تحفظ کی کیا بات ہوسکتی ہے؟ لیکن اقلیتوں کو یہ حق تو نہیں دیا جا سکتا کہ وہ پاکستان کی رعایا ہونے کے بوجود پاکستان کے قوانین سے استثنیٰ کی راہ تلاش کرتی پھریں اور کھلے عام رحمۃ اللعالمین ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات کہتی پھریں۔ لہذا اس معاملے میں اقلیتوں کے تحفظ کی بات کرنا بے تکی بات ہے۔

جو لوگ بے رحم تبصرہ کرتے ہیں اور اسے امتیازی قانون قرار دیتے ہیں ان کی سوچ پر حیرت ہے کہ یہ کیسے امتیازی قانون بن گیا جبکہ اس کا اطلاق تمام مذاہب کے لوگوں پر یکساں ہوتا ہے۔ جو لوگ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ اس قانون کے تحت مقدمہ درج کروانے کا طریقہ کار میں تبدیلی لائی جائے یا اس قانون کے تحت جھوٹا مقدمہ درج کروانے والے کو عبرت ناک سزا دی جائے، دراصل وہ اس قانون کو امتیازی بنانا چاہتے ہیں۔ پھر ان کی دلیلیں بھی بے حد بودی ہیں، یہ کہنا کہ اس قانون کا غلط استعمال ہو رہا ہے لہذا اسے منسوخ کر دیا جائے، ایک ایسی بات ہے اگر اسے مبنی بر جواز تسلیم کر لیا جائے تو پھر پاکستان میں رائج ہر قانون قابل تنسیخ قرار پاتا ہے کیونکہ ملک کا کونسا ایسا قانون ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہوتا کیا با اثر لوگ آج بھی کمزوروں کے خلاف چوری، قتل، اغوا اور ڈاکوں کے جھوٹے مقدمات درج نہیں کرواتے حتی کہ لوگوں کو قتل کے ناحق مقدمات میں پھنسا کر سزائے موت دلوائی جاتی ہے اور تو اور اس ملک کے مقبول ترین وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو جس مقدمے کے تحت سزائے موت دی گئی وہ ان پر ناحق قائم کیا گیا تھا انہیں نہ تو تفتیش کاروں سے انصاف ملا اور نہ ہی عدالتوں سے۔ اس وقت ملک پر راج کرنے والی پاکستان پیپلز پارٹی ان کی موت کو جوڈیشنل مرڈر یعنی عدالتی قتل قرار دیتی ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس قانون کو ختم کر دیا جائے جس کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کو سزائے موت دی گئی (یعنی اعانت جرم)، تو پھر اس بنیاد پر تحفظ ناموس رسالت قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ کیوں کیا جا رہا ہے؟ اسی طرح جھوٹا مقدمہ درج کروانے والے کے لیے بھی ملک میں پہلے سے قوانین موجود ہے۔

مارچ 2012ء

قرآن حکیم اور حضور ﷺ کی گستاخی کے غیر ملکی مجرم پاکستانی قانون کی زد میں

اہل اسلام کو مذہبی جنونیت بنیاد پرستی اور دہشت گردی کا الزام دینے والے نام نہاد روشن خیالوں اور امن عالم قائم کرنے کے جھوٹے دعویداروں کی طرف سے اللہ رب العزت کی آخری کتاب قرآن حکیم اور خاتم النبین حضرت محمد ﷺ کی توہین و تنقیص کی وارداتیں لگا تار ہو رہی ہیں بلکہ آئے روز ان وارداتوں کی سنگینی اور شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی گوانتاناموبے میں قرآن حکیم کو بیت الخلاء میں بہانے کے دل فگار واقعہ سے اُمت مسلمہ تڑپ رہی تھی کہ ملعون پادری ٹیری جونز نے کتاب مقدس کو نذر آتش کر کے شرق و غرب میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کے سینے چھلنی چھلنی کر دیئے ادھر نیٹو فورسز نے افغانستان میں قرآن حکیم کی بے حرمتی کی جسارت کر ڈالی ہے۔ چنانچہ فطرتی طور پر اُمت مسلمہ ایک مرتبہ پھر دل گرفتہ مضطرب اور ملول ہے۔ ان حالات میں اہل اسلام دنیا بھر میں احتجاجی مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بعض نام نہاد روشن خیال لوگ غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرنے والے ان مظاہرین پر پھبتیاں کسیں گے۔ کیونکہ ان کا زور امریکہ اور نیٹو فورسز پر تو چلتا نہیں کہ ان پر ملامت کی چند کنکریاں ہی پھینک دیں البتہ وہ ان مظاہرین پر طعن و تشنیع کے ناوک برسانا ضروری سمجھتے ہیں جو غیرت ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیٹو فورسز کی طرف سے قرآن حکیم

کی بے حرمتی پر پُر امن احتجاج کرتے ہیں۔ایسے ہی نام نہاد روشن خیال حضرات کی طرف سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ہمیں قرآن حکیم اور حضور ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین اور بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف قانونی راستہ اختیار کرنا چاہیے، شاید وہ سمجھتے ہیں کہ طاقت کے نشے میں سرمست امن پسندی کے جھوٹے علم برداروں کو قانون کی زد میں نہیں لایا جاسکتا اس لیے وہ ایسا مشورہ دے دیتے ہیں تا کہ ”نہ تو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔“

لیکن ان کی ان باتوں سے بعض اہل اسلام کو یہ راستہ ضرور سوجھا کہ کیوں نہ ان ملعونین کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کے لیے قانون کا دروازہ ہی کھٹکھٹایا جائے۔چنانچہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے لارجر بنچ میں 2006ء میں ایک آئینی پٹیشن دائر کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ 295.c کے تحت کسی بھی ملزم کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کے حوالے سے Jurisdiction کے مسئلے کو واضح کیا جائے یعنی اگر کوئی ملزم پاکستان کی حدود سے باہر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا قرآن حکیم کی گستاخی یا بے حرمتی کرتا ہے تو کیا پاکستان میں اس کے خلاف اس جرم پر ایف آئی آر درج ہوسکتی ہے؟ سپریم کورٹ کا یہ لارجر بنچ درج ذیل جسٹس صاحبان پر مشتمل تھا۔

۱۔محترم جسٹس افتخار احمد چوہدری

۲۔محترم جسٹس عبدالحمید ڈوگر

۳۔محترم جسٹس سید سعید اشہد

اس لارجر بنچ نے مؤرخہ 17 اپریل 2006ء کو یہ تاریخ ساز فیصلہ سنایا کہ پولیس کو 295.c کے تحت مدعی کی درخواست پر ایف آئی آر درج کر لینی چاہیے خواہ مجرم دنیا کے کسی بھی خطے میں رہ رہا ہو۔ Jurisdiction کے مسئلہ کو واضح کرتے ہوئے لارجر بنچ نے یہ حکم سنایا کہ اس ایف آئی آر کا اندراج اس تھانے میں ہوگا جس کی حدود میں مدعی مستقل سکونت پذیر ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد ضلع جھنگ کے ایک قانون دان محترم محمد زاہد سعید بھٹہ جو کہ تھانہ کوتوالی جھنگ شہر کی حدود میں مستقل سکونت پذیر ہیں مسلسل کوشش کرتے رہے کہ وہ ان مجرموں کو قانون کی زد میں لائیں جنہوں نے ڈنمارک کے اخبار یلندر پوسٹن میں گستاخانہ خاکے شائع کیے اور ان کے بعد بعض دیگر امریکی صحافی اور فیس بک سمیت بعض دیگر ویب سائٹز کے مالکان بھی اس قبیح فعل میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اور ملعون پادری ٹیری جونز جس نے کتاب مقدس کو نذر آتش کر دیا لیکن پولیس ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ چنانچہ انہوں نے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جھنگ کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور فاضل عدالت سے استدعا کی کہ وہ تعزیرات پاکستان کی دفعات 22a-22b کے تحت درج ذیل چار ملزمان کے خلاف توہین رسالت اور توہین قرآن کا مقدمہ درج کرنے کے لیے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو ہدایات جاری کرے:

1.Wayne Sapp State of Florida USA

2.Terry Jones State of Florida USA

3.Websit:www.youtube.com

Florida Church Burn Quran and all others websites including Face book & Google.

4.President Pakistan Telecommunication Corporation Limited Islamabad , Pakistan.

ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج جھنگ نے جرأت مندانہ فیصلہ کرتے ہوئے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو مقدمہ کے اندراج کا حکم دے دیا۔ چنانچہ مؤرخہ 25 فروری 2012ء کو تھانہ کوتوالی جھنگ میں ان مجرموں کے خلاف ایف آئی آر نمبر 133 زیر دفعہ 295.c درج ہو چکی ہے۔ محترم محمد زاہد سعید بھٹہ ایڈووکیٹ نے بڑی جاں گسل جدوجہد کے بعد مذکورہ ایف آئی آر درج کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے بلاشبہ وہ پوری قوم کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

ایف آئی آر کا اندراج اب انتظامیہ اور حکمرانوں کے لیے اس حوالے سے ایک کڑا امتحان ہے کہ کیا وہ ان بااثر بین الاقوامی ملزموں پر ہاتھ ڈال سکیں گے یا نہیں؟ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ وہ امریکی مجرم جو پاکستان میں ارتکاب جرم کرتے ہیں امریکہ انہیں بھی پاکستانی جیلوں سے چھڑا کر لے جاتا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہمارے حکمرانوں کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ وہ انٹرپول کے ذریعے ان مجرموں کی گرفتاری کو یقینی بنا سکیں اور انہیں پاکستانی عدالتوں میں ٹرائل کے مرحلہ سے

گزار سکیں۔ عافیہ صدیقی اور نہ جانے کتنے ہی نامعلوم پاکستانیوں کو چند ڈالروں کے عوض بے دردی کے ساتھ امریکہ کے سپرد کر دینے والے حکمرانوں کے لیے یہ یقیناً ایک کڑا امتحان ہے۔

دوسری طرف قانون کی عملداری کے نعرے بلند کرنے والے اہل مغرب کے لیے بھی یہ ایک کڑا امتحان ہے کہ وہ قانون کی پاسداری کرتے ہوئے پاکستانی عدالتوں کا سامنا کرتے ہیں یا نت نئی قانونی موشگافیوں کا سہارا لے کر عدالتوں سے راہ فرار حاصل کرتے ہیں۔ اگر یہ ملزم گرفتار ہو جائیں اور انہیں پاکستانی عدالتیں سزا سنا دیں تو اس سے اس نہایت نازک اور حساس معاملے کو ایک نئی راہ مل سکتی ہے جس کے بعد شاید کوئی بد بخت کرۂ ارض پر حضور ختمی المرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کی توہین کی جسارت کر سکے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ ملزم قانون کی زد میں نہیں آتے تو پھر نہ تو یہ بات اہل مغرب کے لیے جائز ہوگی اور نہ ہی ان کے حواریوں کے لیے جنہوں نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے کہ وہ ایسے ملعونین کے ماورائے قانون قتل پر شور و غل کریں کیونکہ جب ملزم قانون شکنی کرتے ہوئے اپنے آپ کو قانون کی زد سے بچا لیتا ہے تو مدعی کے پاس بھی ماورائے قانون چارہ جوئی کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا۔ اس ایف آئی آر کے اندراج کے بعد اب معاملہ پاکستانی حکومت اور خود امریکی اور مغربی ریاستوں کے سربراہان پر آن ٹھہرا ہے کہ وہ کرۂ ارض پر بسنے والے مسلمانوں کو انصاف فراہم کرتے ہیں یا قانون شکنی کا راستہ دکھاتے ہیں۔

جون 2012ء

غازی ممتاز حسین قادری کے اقدام کی تصویب

اُمت مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کو اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں ''سبیل المومنین'' سے تعبیر فرمایا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء:۱۱۵)

اور جو رسول کا خلاف کرے بعد اس کے کہ حق راستہ اس پر کھل چکا اور مسلمانوں کی راہ سے جدا راہ چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور اسے دوزخ میں داخل کریں گے اور کیا ہی بری جگہ ہے پلٹنے کی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سبیل المومنین سے ہٹ جانا اور تفرد اختیار کرنا ضلالت اور گمراہی ہے۔ بدنصیبی سے آج کل یہ فیشن بنتا جا رہا ہے کہ نئے نئے شگوفے چھوڑ کر اپنے آپ کو علمی دنیا میں ممتاز اور منفرد بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ایسا ہی معاملہ اس وقت پیش آیا جب غازی ممتاز حسین قادری نے سلمان تاثیر کو قتل کر ڈالا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ غازی ممتاز حسین قادری کی سلمان تاثیر کے ساتھ کوئی ذاتی عداوت نہیں تھی بلکہ سلمان تاثیر کے وہ کلمات اور اقدام جنہیں تقریباً پوری امت نے توہین رسالت پر محمول کیا اور جن کی وجہ سے پوری قوم کی دل آزاری اور مذہبی جذبات

مجروح ہوئے وہی کلمات اور اقدامات اس کے قتل کی بنیاد بن گئے۔ چنانچہ اس کے قتل کے بعد قوم نے سکون کا سانس لیا اور خوشی سے مٹھائیاں تقسیم کیں۔ حکومتی دباؤ کے باوجود سلمان تاثیر کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کسی بھی مکتب فکر کا کوئی بھی عالم دین تیار نہ ہوا۔

ایک عالم دین نے نفس مسئلہ سمجھے بغیر عجلت میں اس کے ورثا اور لواحقین کے ساتھ تعزیت اور تاسف کا اظہار کیا تو ان کی اپنی علمی حیثیت مشتبہ ہوگئی۔ ان کا علمی وقار مجروح ہوا اور آج تک وہ اس وقار کی بحالی کے لیے دورنگی اختیار کرنے پر مجبور ہیں چنانچہ جب وہ عوام کے سامنے جاتے ہیں تو غازی ممتاز حسین قادری کے ساتھ اظہار یکجہتی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اپنی نجی مجالس میں ان کے اس جری اقدام پر انہیں مطعون بھی کرتے ہیں۔ غازی ممتاز حسین قادری کے اس اقدام کے بعد علمی میدان میں صرف ایک ہی شخصیت نظر آئی جس نے غازی صاحب کے اقدام کی تائید وتصویب کرنے کی بجائے سابقہ گورنر سلمان تاثیر کی حمایت کی اور یہ جاوید احمد غامدی ہیں انہوں نے اس کی حمایت میں یہ موقف اختیار کیا کہ شاتم رسول سے نمٹنے کیلئے ملک میں قانون موجود ہے لہذا کسی شخص کو بھی یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ قانون کو ہاتھ میں لے کر قاضی یا امام سے سبقت لیتے ہوئے شاتم رسول کو قتل کرڈالے۔ حالانکہ یہ معاملہ بالکل واضح ہے کہ سلمان تاثیر کو گورنر ہونے کی حیثیت سے یہ دستوری استثنیٰ حاصل تھا کہ اس کے خلاف کوئی سول یا فوجداری کاروائی نہیں کی جاسکتی تھی۔

چنانچہ جب اس کے خلاف 295 سی کے تحت مقدمہ دائر کرنے کے لیے تھانہ سول لائن میں درخواست دی گئی تو اس کے خلاف کوئی بھی کاروائی عمل میں نہ آئی اور اسے حاصل دستوری استثنیٰ کی رو سے اس درخواست کو داخل دفتر کر دیا گیا۔

پھر قانون کی پاسداری کا غلغلہ اپنی جگہ پر لیکن دیکھنا تو یہ چاہیے کہ اگر بفرض محال کوئی شخص قانون کی پاسداری نہ کرتے ہوئے کسی شاتم کو ماورائے عدالت قتل کر دیتا ہے تو شریعت میں اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ شریعت کا معمولی فہم رکھنے والا ایک عام طالب علم بھی یہ بات بخوبی سمجھتا ہے کہ گستاخ رسول کا معاملہ نصوص صریح کی روشنی میں ایک استثنائی معاملہ قرار پاتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری حیات مبارکہ میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے غیرت ایمانی کے سبب شتم رسول کا ارتکاب کرنے والوں کو ماورائے عدالت یعنی امام اور قاضی سے سبقت لے کر جہنم رسید کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان جہنم رسید ہونے والوں کے خون کو رائیگاں اور باطل قرار دیا اور انہیں جہنم رسید کرنے والے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے قصاص یا دیت کا مطالبہ نہ فرمایا اور نہ ہی انہیں کوئی تعزیری سزا دی بلکہ تنبیہہ تک بھی نہ فرمائی۔ کتب سیرت و تفسیر میں یہ مشہور واقعہ منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس منافق کا سر قلم کر دیا تھا جس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر تنگی کا اظہار کیا تھا۔ وحی الٰہی نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کی تصویب فرمادی تھی۔ بعض واقعات میں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاتم کو جہنم رسید کرنے والے صحابی کی

تحسین فرمائی جیسا کہ حضرت عمیر بن عدیؓ کے واقعہ میں موجود ہے جنہوں نے اسماء بنت مروان کو جہنم رسید کیا تھا۔ان کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کہ اگر کسی شخص نے ایسے کو دیکھنا ہو جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی غیبی مدد کی تو وہ عمیر بن عدیؓ کو دیکھ لے۔لہذا اگر کوئی ایسے لعین کو قاضی یا امام سے سبقت لے کر بھی قتل کر دیتا ہے تو وہ از روئے شرع معتوب نہیں ہوگا اور نہ ہی مستحق سزا (قصاص و دیت) قرار پائے گا۔

پھر موصوف نے فقہائے احناف کی طرف سے شاتم کی توبہ کی قبولیت کے حوالے سے مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ حالانکہ یہ بات تو بے حد واضح تھی کہ سلمان تاثیر سے متعدد علماء کرام نے توبہ اور تجدید اسلام کا مطالبہ کیا تھا لیکن وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ نہ صرف اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا بلکہ علماء کرام کے ان شرعی فتوؤں کا بھی استخفاف کرتا رہا جن کی بنیاد کتاب وسنت کی نصوص ہیں اور ان شرعی فتوؤں کا استخفاف فی نفسہ موجبات کفر میں سے ہے۔توبہ کی قبولیت کے حوالے سے احناف کے درست موقف کی وضاحت اس عاجز نے کر دی تھی جو روزنامہ جنگ لاہور کے اقراء ایڈیشن میں تین اقساط میں شائع ہوئی اور ماہنامہ سوئے حجاز میں بھی اسے دو قسطوں میں شائع کیا گیا۔(اب اس میں اضافات کر کے الگ کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے)

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ جاوید احمد غامدی کے تفردات پر اہل علم پہلے ہی مضطرب ہیں اور کئی مسائل پر ان کو آڑے ہاتھوں لے چکے ہیں ان کے شاگرد

رشید حافظ محمد عمار ناصر نے بھی اس مسئلہ پر جو رسالہ تحریر فرمایا اس کا عنوان ''توہین رسالت کا مسئلہ، چند اہم سوالات کا جائزہ'' ہے۔ راقم ناچیز نے اس کتابچہ کا رد بھی لکھ دیا ہے جو ماہنامہ سوئے حجاز میں ہی کئی اقساط میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا ہے اور اب اسے الگ کتاب کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے (زیر نظر کتاب بھی اسی رد کا اہم حصہ ہے) یہ معاملات تو غازی صاحب کے اقدام کے بعد سامنے آئے لیکن غازی صاحب کے ٹرائل کے بالکل آخری دنوں میں معروف عالم دین ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا ایک ایسا بیان سامنے آگیا جس سے پوری قوم ایک مرتبہ پھر مضطرب ہوگئی۔ ان کا یہ بیان نہ تو اس مسئلہ پر ان کے سابقہ علمی مؤقف کے موافق تھا اور نہ ہی قوم کے مذہبی جذبات اور اجتماعی ضمیر کی ترجمانی کرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا یہ تازہ موقف کتاب وسنت سے بھی میل نہیں کھاتا تھا چنانچہ ہم نے ان کی خدمت میں وہ فتویٰ بھی بھجوایا تھا جسے محقق عصر مفتی محمد خان قادری حفظہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں مرتب کیا گیا تھا اور ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم سے تقریباً تمام مکاتب فکر کے جید علماء کرام نے اس کی تائید فرمائی تھی۔ یہ فتویٰ دراصل غازی ممتاز حسین قادری کے اقدام کی تائید اور تصویب کے لیے لکھا گیا تھا۔

ہم نے جن احباب کی وساطت سے یہ فتوی ان کی خدمت میں بھجوایا تھا ان سے یہ عرض بھی کی تھی کہ وہ اپنے تازہ موقف پر نظر ثانی فرمائیں لیکن شاید اس وقت یہ سنجیدہ علمی مسئلہ ایک دنگل کی شکل اختیار کر چکا تھا اور گرما گرمی کے اس ماحول میں

ہماری یہ درخواست صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ابھی چند ہفتے قبل جب امیر دعوت اسلامی حضرت مولانا الیاس عطار قادری کا ایک بیان اسی حوالے سے منظر عام پر آیا تو ایک مرتبہ پھر پوری قوم میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔لیکن اس مرتبہ حضرت محقق عصر نے فوری اقدام کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد الیاس قادری کو نصح و خیر خواہی پر مبنی ایک خط تحریر فرمایا اور ان کو اس خط کے ہمراہ مفید لٹریچر اور فتاوی جات بھی ارسال کیے اور انہیں درخواست کی کہ وہ ان کی روشنی میں اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائیں۔چنانچہ بحمد اللہ تعالیٰ انہوں نے چند روز قبل اس حوالے سے اپنا توضیحی بیان جاری فرمایا ہے جو اہل علم اور عوام کے لیے اطمینان بخش ہے۔ہم حضرت مولانا محمد الیاس عطار قادری کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے مؤقف پر نظر ثانی فرمائی اور اس موقف کو اپنانے اور بیان کرنے میں تأمل نہ فرمایا جو احکام شریعت کی درست تعبیر پر مبنی ہے۔حق بات تو یہ ہے کہ ازل سے علمائے حق کا یہی وطیرہ رہا ہے کہ وہ قبول حق میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں فرماتے۔

ہم مولانا ڈاکٹر محمد طاہر القادری سے بھی عرض پرداز ہیں کہ وہ بھی اپنے مؤقف پر نظر ثانی فرمائیں، اگر اس واقعہ سے متعلق مکمل معلومات میسر نہ ہونے کی بنا پر انہوں نے عجلت میں کوئی بیان جاری فرمایا ہے تو اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے اور واضح اور درست مؤقف کے بیان میں کوئی تأمل نہیں ہونا چاہیے۔ہماری اسی درخواست کا محرک محض اور محض اللہ اور اللہ کے حبیب کی رضا کا حصول ہے اور ہم

صدق دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر پوری امت بالخصوص اہل سنت والجماعت متحد اور متفق ہو جائیں۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کوششوں کو ثمر بار فرمائے (آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم)۔

دسمبر 2014

توہین رسالت اور ماورائے عدالت اقدام

کوٹ رادھا کشن میں اہانت قرآن اور توہین رسالت کے الزام پر مسیحی جوڑے کو زندہ جلا دیا گیا جس پر ایک شدید ردعمل دیکھنے کو ملا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی کیونکہ قانون تحفظ ناموس رسالت موجود ہے اور اس قانون کے ہوتے ہوئے کسی بھی ملزم کو تحقق وثبوت جرم کے بغیر ماورائے عدالت خود ہی سزا دیدینا دراصل لاقانونیت کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ اس طرح ملک میں کبھی بھی قانونی کی حکمرانی کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بلاشبہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کرنے والے کی سزا رائج الوقت قانون اور شریعت اسلامی کے تحت موت ہی ہے اور اس کا یہ جرم ہرگز قابل معافی نہیں، لیکن اس کے لیے مناسب راستہ یہی ہے کہ ایسا معاملہ قانون کے سپرد کر دیا جائے۔ پھر اس واقعہ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ مسیحی جوڑے کو زندہ جلا دیا گیا حالانکہ اسلام میں اس کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ کسی مباح الدم شخص کو

جان سے مار دینا اور بات ہے جبکہ اسے جلا دینا تو بالکل ہی ناپسندیدہ عمل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا عذاب مت دو، اسی طرح میدان جنگ میں ہلاک ہونے والے دشمنوں کی لاشوں کو مسخ کرنے سے بھی روک دیا گیا۔

ہماری دانست میں اب اس معاملہ کا صحیح حل یہ ہے کہ اس کی صاف اور شفاف عدالتی تحقیق کی جائے۔ اگر مقتولین پر عائد الزام درست ثابت نہ ہوں تو قاتلوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کے برعکس اگر الزام صحیح ثابت ہوں تو پھر مسیحی جوڑے کے قتل کے ملزمان پر کوئی قصاص یا دیت نہیں کیونکہ وہ اصلاً مباح الدم قرار پائیں گے۔ اس صاف اور واضح حل کی بجائے بعض حضرات نے اس واقعہ کی آڑ میں پھر سے قانون تحفظ ناموس رسالت کے بارے میں شکوک وشبہات کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی طرف سے پھیلائے جانے والے یہ شکوک وشبہات نئے نہیں ہیں اور یہاں ان کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں، کیونکہ ان کے تشفی جوابات اہل علم نے دے رکھے ہیں البتہ اس مرحلہ پر یہ سوچنا ضروری ہے کہ جب کبھی بھی ماورائے عدالت کسی بھی توہین رسالت کے ملزم کو قتل کر دیا جاتا ہے تو یہ حضرات قانون تحفظ ناموس رسالت کے خاتمہ کے لیے آواز کیوں اُٹھانا شروع کر دیتے ہیں؟ مسئلہ قانون کو ہاتھ میں لینے کا ہے اور اس کا حل یہ بتایا جا رہا ہے کہ قانون کو ختم کر دیا جائے۔ ان بقراطوں سے یہ پوچھا جائے کہ اگر یہ قانون ختم کر دیا گیا تو کیا پھر ایسے ملزموں کو ماورائے قانون قتل کرنے کے واقعات میں کمی آجائے گی؟ ایک موثر قانون کے ہوتے ہوئے

لوگ ایسے ملزموں سے بوجوہ ماورائے قانون ہی نمٹنے کو ترجیح دے رہے ہیں، جب یہ قانون ختم کر دیا جائے گا تو پھر بلا ان کے پاس چارہ جوئی کا کیا راستہ بچے گا؟ یقیناً اس طرح ماورائے قانون قتل کرنے کا رجحان مزید فروغ پائے گا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اس رجحان کی حوصلہ شکنی کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں نہ کہ قانون کے خاتمے کا مطالبہ جو کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ خود اقلیتوں کے رہنماؤں کو بھی اس قانون پر اعتراض نہیں ہے بلکہ وہ ان اقدامات پر شکوہ کناں نظر آتے ہیں جو ماورائے قانون وعدالت کیے جاتے ہیں، پھر ملزم کے ساتھ ساتھ اس کے اہل خانہ اور کبھی کبھار پوری بستی کے لوگوں کو دھر لیا جاتا ہے، ان بے گناہوں کے اموال اور جانوں کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ جب ہم ایسے ملزموں کو ماورائے قانون قتل کرنے کے رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں تو جذباتیت کے علاوہ اس کا ایک سبب یہ بھی نظر آتا ہے کہ آج تک توہین رسالت کے کسی بھی ملزم پر سزا نافذ نہیں ہوئی۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ٹرائل کورٹ جن ملزموں کو سزائے موت سناتی ہے تو بالائی عدالتوں سے انہیں ریلیف مل جاتا ہے اور ان کی سزا ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیرونی طاقتوں کے زیر اثر ایسے ملزموں کو حکومتی مداخلت کے ذریعے رہا کروا لیا جاتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ انہیں بیرون ملک منتقل کر کے اعزاز واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کا اس حوالے سے قانون اور عدالتوں پر اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور وہ ایسے ملزموں کے ساتھ ماورائے قانون وعدالت ہی نمٹنے کو

ترجیح دینے لگے ہیں۔اس صورت حال کے ازالہ کے لیے ضروری ہے کہ عدالتیں ایسے ملزموں کے مقدمات کی سماعت کسی خارجی دباؤ کے بغیر عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ طور پر کریں۔ثبوت جرم پر انہیں قرار واقعی سزا دینے سے گریز نہ کریں۔ان شکوک وشبہات پھیلانے والے حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر غازی ممتاز حسین کو سزا دی جاتی تو یہ واقعات رُک جاتے، ان حضرات کی سوچ کا یہ انداز یقیناً درست نہیں ہے البتہ ماورائے عدالت اقدام کو روکنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک دو ایسے مجرموں کو سزا دی جائے جو توہین رسالت کے مرتکب ہوئے ہوں۔اب تو خیر سے حکومت نے موت کی سزا ہی معطل کر رکھی ہے، جب عدالتیں حدود کے مقدمات میں بھی کسی مجرم کو موت کی سزا نہیں دے سکیں گی تو ماورائے عدالت قتل کے یہ واقعات کیسے رُک سکیں گے؟

ان حضرات کی کوتاہ نظری اس اعتبار سے بھی قابل افسوس ہے کہ غازی ممتاز حسین کا اقدام ان عام واقعات سے کئی اعتبار سے مختلف ہے: سلمان تاثیر کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لیے پوری کوشش کی گئی لیکن جب اس کے خلاف پولیس نے مقدمہ قائم کرنے سے انکار کر دیا تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا راستہ مسدود ہو گیا۔حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ اس کے خلاف ایف آئی آر درج کر دیتی۔خواہ اسے اس کے منصب سے الگ ہونے تک منجمد کر دیا جاتا، یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے اس کے منصب سے الگ کر دیتی اور وہ قانون کا سامنا کرتا، پھر سلمان تاثیر کوئی عام شخص

نہیں تھا بلکہ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کا گورنر تھا، اسے اس حیثیت میں میڈیا تک رسائی حاصل تھی، اگر وہ چاہتا تو اپنے اقدام پر ندامت کا اظہار کرتا اور توبہ کر لیتا لیکن اس نے تو اُلٹا میڈیا کو بتکرار اہانت کرنے کے لیے استعمال کیا۔ لہذا اس کی گستاخیاں کسی محلہ یا گاؤں تک محدود نہ تھیں بلکہ پوری دنیا تک پھیل گئی تھیں۔ ایسے شخص کو نظر انداز کرنا بھی بدبختوں کے ہاتھ میں توہین رسالت کا لائسنس تھما دینے کے مترادف تھا۔ سلمان تاثیر کا میڈیا کے روبرو تحفظ ناموس رسالت کے قانون کو کالا قانون کہنا اور توہین رسالت کی سزا یافتہ مجرمہ کی پشت پناہی کرنا، اس کے اعتراف جرم کے باوجود اسے بے گناہ اور معصومہ قرار دینا اور اس کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے اس کی رحم کی اپیل پر دستخط کروانا خود ایک ایسی لاقانونیت تھی جس کا ارتکاب کسی گورنر کو تو درکنار عام شہری کو بھی زیب نہیں دیتا تھا۔ پھر یہ سب کچھ میڈیا کے روبرو ہوا، جسے پوری قوم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا۔ اُصولاً تو اس علی الاعلان اور میڈیا کے روبرو کی گئی اہانت پر کسی شہادت کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور جرم پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے، لہذا غازی ممتاز حسین قادری کا اقدام ہر گز مبنی بر جواز تھا اور اسے ان واقعات کے ساتھ کوئی مماثلت حاصل نہیں ہے جن میں قانونی چارہ جوئی کیے بغیر کسی ملزم کو ماورائے قانون مار دیا جاتا ہے یا جن میں تحقق جرم کے لیے گواہیاں اور ثبوت مفقود ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غازی ممتاز حسین کا مقدمہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی پیروی تین ریٹائرڈ جسٹس صاحبان کر رہے ہیں ان

کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

۱۔محترم جسٹس (ر) میاں نذیر اختر صاحب

۲۔محترم جسٹس (ر) خواجہ محمد شریف صاحب

۳۔محترم جسٹس (ر) نذیر احمد غازی صاحب

یہ تینوں ریٹائرڈ جسٹس صاحبان راسخ العقیدہ اور متدین ہیں اور تینوں ہی قانون کی حکمرانی کے لیے ساری زندگی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔لہذا ان کی قانون فہمی میں کسی کو کیا شک ہوسکتا ہے؟اس کے باوجود وہ نہ صرف غازی ممتاز حسین قادری کے اقدام کو درست سمجھتے ہیں بلکہ ہائی کورٹ اسلام آباد بنچ میں غازی صاحب کی طرف سے دائر کردہ اپیل کی پیروی بھی کر رہے ہیں۔

فروری 2017ء

قانون توہین رسالت
پھر سازشوں کی زد میں

غازی محمد ممتاز قادری کی شہادت کے بعد اگرچہ سیکولر اور لبرل حضرات کے کلیجے ٹھنڈے ہو گئے تھے لیکن ان کے جنازے میں لاکھوں لوگوں کا جوش وخروش دیکھ کر ان کی نیندیں پھر سے اُڑ گئیں ۔ پاکستانی میڈیا نے تو اس پُرشکوہ جنازے کی کوریج سے اجتناب کیا لیکن بی بی سی جیسی غیر ملکی خبر رساں ایجنسی نے نہ صرف اس عظیم الشان جنازے کے مناظر دکھائے بلکہ نیوز کاسٹر کو یہ کہنا پڑا کہ اس

جنازے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں توہین رسالت کا معاملہ کتنا حساس اور نازک ہے۔

سیکولر اور لبرل حضرات پر مشتمل یہ لابی بظاہر اس جنازے کے بعد خاموش ہو گئی لیکن در پردہ اس کی سرگرمیاں جاری رہیں جن کا اندازہ واضح طور پر تب ہوا جب آسیہ مسیح کی اپیل سپریم کورٹ آف پاکستان میں زیر سماعت لانے کا انتظام کیا گیا۔ اپیل کی سماعت سے پہلے ہزاروں غیر ملکیوں نے ہماری عدالت عظمیٰ کے فاضل جج صاحبان کو ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے خطوط لکھے جن میں آسیہ مسیح کو بے گناہ ظاہر کیا گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی دہائیاں دی گئیں لیکن سماعت کے روز بنچ کے ایک فاضل جج نے بنچ کا حصہ بننے پر معذوری ظاہر کر دی، یوں یہ بنچ ٹوٹ گیا اور اپیل کی سماعت غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دی گئی۔ مسلمانان پاکستان کو یہ اندیشہ ہے کہ جس طرح غازی محمد ممتاز قادری شہید کو یورپی یونین کے دباؤ پر شہید کیا گیا اسی طرح اس دباؤ کے ذریعے آسیہ مسیح کو بھی عدالت عظمیٰ سے بری کروالیا جائے گا۔

آسیہ مسیح کے کیس پر نظر رکھنے والے یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ اس نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا تھا جس پر اس کے خلاف ملک میں رائج قانون کے تحت قانونی چارہ جوئی کی گئی اور اسے گرفتار کر کے شامل تفتیش کیا گیا۔ ایس پی سطح کے پولیس آفیسر نے اس مقدمے کی تفتیش کی اور اس میں اس کے اپنے اعتراف پر اسے گناہ گار پایا جس کے گواہ اس کے اپنے ہم مذہب لوگ بھی ہیں جو دوران تفتیش وہاں

موجود تھے۔ اس کے بعد مجاز عدالت میں اس کا ٹرائل شروع ہوا، اس کے دفاع کے لیے بہترین وکیل موجود رہے لیکن عدالت نے ثبوت جرم پر اسے موت کی سزا سنا دی۔ اس سزا کے خلاف مجرمہ نے ہائیکورٹ میں اپیل کی۔ چنانچہ ہائیکورٹ نے بھی اس کی سزا کی توثیق کر دی۔ لہذا کوئی وجہ نہیں بنتی کہ اسے سزا نہ دی جا سکے۔ جو لوگ اسے سزا سے بچانے کی باتیں کر رہے ہیں وہ دراصل ملک میں لاقانونیت کا راج دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کو بچانے کے بعد لوگوں کا عدالتوں پر اعتماد اُٹھ جائے گا اور آئندہ وہ قانونی چارہ جوئی کی بجائے از خود اقدام کر کے ایسے مجرموں کو موقع پر ہی قتل کر دینے کو ترجیح دیں گے اور پھر یہی لبرل اور سیکولر لوگ قانون کو ہاتھ میں لینے کا واویلا کریں گے۔

آسیہ مسیح کا مقدمہ خود عدالت عظمیٰ کے لیے بھی ایک آزمائش ہے اگر وہ کسی دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آسیہ مسیح کی سزا برقرار رکھتی ہے تو اس کا وقار بلند ہو گا اور اس سے عوام کا قانون اور انصاف کرنے والے اداروں پر اعتبار بڑھے گا۔ آئندہ بھی لوگ ایسے بدبختوں کے ساتھ نمٹنے کے لیے قانونی راستہ اختیار کرنے کو ہی ترجیح دیں گے۔ جبکہ بصورت دیگر لوگوں کا عدالتوں پر اعتماد اُٹھ جائے گا۔

توہین رسالت کے قانون کو غیر مؤثر بنانے کی کوشش بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ 12 جنوری 2017ء کو روزنامہ نوائے وقت کے صفحہ "۲" پر چوتھائی صفحے پر مشتمل اشتہار شائع کیا گیا۔ بظاہر مشتہر نے یہ اشتہار کسی سلسلہ قادریہ چشتیہ کے خادم کی حیثیت سے شائع کروایا لیکن اس اشتہار کے مندرجات سراسر جھوٹ اور بہتان پر

مبنی ہونے کے باعث ہم یہ سمجھ گئے تھے کہ یہ کوئی نام نہاد سلسلہ قادریہ چشتیہ ہے جو قانون توہین رسالت کو ختم کرانے کے درپے ہے۔ چنانچہ ہم نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ خود کو اس سلسلے کا پیشوا ظاہر کرنے والا سائیں اسحاق شاہ تلہ گنگ کا رہنے والا ہے جو 25 سال امریکہ میں گزار کر آیا تھا اور وہاں سے امریکی صوفی ازم کی خصوصی تربیت لے کر میدان میں اُترا تھا، اس کے پیروکار اسے رسول کہتے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے اور وہ انہیں ٹوکنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ چنانچہ علاقے کے غیور مسلمانوں نے اس کے ساتھ مکالمہ کیا اور جب اس نے توبہ کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے اپنی جعلی خانقاہ پر ہونے والی بدعقیدگی اور توہین رسالت کا دفاع کرنا شروع کیا تو انہوں نے بلاتوقف اس کے خلاف توہین رسالت کا مقدمہ درج کروادیا، جس کے تحت اسے سزا ہوچکی ہے اور ایمنسٹی انٹرنیشنل جیسی انسانی حقوق کی تنظیمیں اور امریکی شہری دباؤ ڈال کر اسے عدالت عالیہ سے ریلیف دلوانا چاہتے ہیں۔ اسی کے ایک مرید نے مذکورہ اشتہار کی اشاعت کا بندوبست کیا جس میں واضح طور پر توہین رسالت کے قانون کے حوالے سے بے بنیاد باتیں کی گئیں اور اس قانون کو ختم کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

بحمد اللہ ہم نے اس کا بروقت نوٹس لیا اور نوائے وقت کی انتظامیہ کے ساتھ رابطہ کیا۔ بالآخر روزنامہ نوائے وقت نے اپنی 27 جنوری کی اشاعت میں اس اشتہار کے شائع کرنے پر معذرت کر لی اور ہمیں یہ بھی یقین دلایا گیا کہ وہ ہمارا موقف بھی

بصورت اشتہار شائع کر دیں گے۔ ہم نے اشتہار کا جوابی مؤقف تیار کر رکھا ہے، اُمید ہے کہ نوائے وقت کی انتظامیہ اپنے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے ہمارے جوابی مؤقف کی اشاعت کا بھی اہتمام کرے گی۔

اس اشتہار کے ایک دو روز بعد معروف سیکولر سینیٹر فرحت اللہ بابر کا بیان بعض اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوا کہ سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق قانون توہین رسالت کے حوالے سے "Procedural laws" تشکیل دینے کی تجاویز پر غور و فکر کرے گی تا کہ اس قانون کے غلط استعمال کی روک تھام کا انتظام کیا جا سکے۔ اسی طرح انہوں نے یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ وہ (c) 295 یعنی Substantive law پر بھی غور و فکر کرے گی اور اس کی سزا کو کم تر بنانے کی تجاویز کا بھی جائزہ لے گی۔ چنانچہ ہم نے "ملی مجلس شرعی" کے تحت چیئرمین سینیٹ، قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق کی چیئرپرسن اور دیگر ممبران کو ایک مفصل خط بھجوا دیا ہے جس میں ہم نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ یہ غور و فکر ایک سعی لاحاصل ہے کیونکہ خود سینیٹ جیسے ادارے کتاب و سنت کی روشنی میں توہین رسالت کی سزا موت ہونے پر متفق ہو چکے ہیں اور یہ قانون ملک کی مجاز عدالتوں نے بھی کتاب و سنت کے منضبط احکام کے مطابق قرار دیا ہے۔ اسی طرح انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس کے "Procedural laws" میں بھی اگرچہ پہلے سے ہی ضروری تبدیلی کی جا چکی ہے تاہم ہم نے انہیں اس حوالے سے کچھ تجاویز بھی دیں۔

افادہ عام کے لیے ہم یہ خط اور نوائے وقت میں شائع ہونے والا اشتہار اور نوائے وقت کی انتظامیہ کی طرف سے شائع ہونے والا اعتذار اور اپنا جوابی مؤقف سوئے حجاز کی اسی اشاعت میں شامل کرر ہے ہیں۔(اب ان دونوں کو کتاب ہذا میں شامل کردیا گیا ہے) ہماری دانست میں یہ سب باتیں لغو اور حقائق سے کوسوں دور ہیں جو لوگ بھی اس قانون کو کسی بھی طرح سے غیر مؤثر بنانے کی باتیں کرتے ہیں وہ شاید اس ملک میں قانون کی حکمرانی نہیں دیکھنا چاہتے اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ ملک میں فتنہ وفساد اور انتشار پھیلے۔

ہمارے قریبی دوستوں نے ہمارے ساتھ مشاورت کے بعد سینیٹ کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق کے خلاف عدالت عالیہ لاہور میں رٹ بھی دائر کی ہے جس پر عدالت نے قائمہ کمیٹی کو اپنا مؤقف پیش کرنے کے لیے طلب کیا ہے کیونکہ مجاز شرعی عدالتوں کے فیصلے کے بعد اب سینیٹ یا قومی اسمبلی اس قانون میں تبدیلی نہیں کرسکتی۔

اُمید ہے کہ تمام حکومتی ادارے اس مسئلہ میں ذمہ دارانہ کردار ادا کریں گے اور قانون توہین رسالت میں غیر ضروری ترامیم کے لیے نامعقول تجاویز کا پنڈورا بکس کھولنے سے اجتناب کریں گے۔

اپریل 2017ء

سوشل میڈیا پر توہین رسالت کے تدارک کی عملی صورتیں

آج کل سوشل میڈیا پر بلاگرز کی طرف سے کی جانے والی توہین رسالت کے دلخراش واقعات پر اسلامیان پاکستان بجا طور پر دل گرفتہ اور ملول ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر کی جانے والی یہ کارروائیاں عام زندگی میں انفرادی طور پر کسی بدبخت کی طرف سے کی جانے والی واردات کے مقابلے میں اپنے طریقہ کار اور اثرات ونتائج کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

عام زندگی میں اگر کوئی ملعون یہ واردات کرتا ہے تو اس کو دیکھنے، سننے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے لیکن سوشل میڈیا کے ذریعے آناً فاناً یہ قبیح حرکت لاکھوں لوگوں تک پہنچ جاتی ہے اور یہ سلسلہ بڑھتا رہتا ہے حتی کہ پوری قوم مضطرب ہو جاتی ہے اور اس کا غم وغصہ ایک آتش فشاں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ عام انفرادی واردات میں تو مجرم پر قابو پایا جا سکتا ہے اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا ممکن ہوتا ہے لیکن سوشل میڈیا پر توہین کی صورت میں اصل ملزموں تک پہنچنا یقیناً ایک دشوار اور محنت طلب کام ہے اور عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے، البتہ حکومتی ادارے محنت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ان تک پہنچ سکتے ہیں۔

تیسرا اہم فرق یہ ہے کہ چونکہ ان ملزموں تک رسائی مشکل اور محنت طلب کام ہے، لہٰذا یہ عام مجرموں کی طرح قانون کے شکنجے میں نہ آسکنے کے باعث دندناتے پھرتے ہیں اور اپنی ان ذلیل حرکتوں سے باز آنے کی بجائے انہیں دہراتے رہتے ہیں اور یوں اہل اسلام کی غیرت اور حمیت پر مسلسل حملے کرتے رہتے ہیں۔

سائبر کرائمز ایکٹ کے نافذ العمل ہونے کے باوجود اس حوالے سے بلاگرز کی طرف سے ہونے والی حالیہ کاروائیوں پر حکومتی ادارے میٹھی نیند سو رہے تھے کہ یکا یک انہیں جسٹس شوکت عزیز صدیقی کے جرأت مندانہ فیصلے نے بیدار کر دیا۔ یہ فیصلہ جہاں عوامی جذبات کا ترجمان تھا وہاں اس فیصلے سے ملحدین اور ان کے سہولت کاروں کی نیندیں حرام ہو گئیں اور ان کی طرف سے اس فیصلے اور فیصلہ کرنے والے جج صاحب پر تنقید کے ناوک برسنے لگے لیکن یہ غنیمت ہے کہ اس فیصلے کے بعد ایف آئی اے کے حکام اور خود وزیر داخلہ نے ملزموں تک پہنچنے اور ان کے خلاف قانونی کاروائی کرنے اور ایسے پیجز، بلاگرز اور آئی ڈیز کو بلاک کروانے کا بھی عندیا دیا ہے۔ کچھ نہ کچھ حوصلہ افزا پیش رفت بھی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ ایک خبر کے مطابق ایف آئی اے کے متعلقہ حکام نے بعض افراد کو گرفتار کر لیا ہے اور ان سے باز پرس اور تفتیش جاری ہے۔ ان کے لیپ ٹاپ فورینزیک معائنہ کے لیے بھجوا دیئے گئے ہیں جبکہ ان سے غیر ملکی سمیں بھی برآمد ہونے کا انکشاف کیا گیا ہے۔

جسٹس شوکت عزیز صدیقی کا یہ فیصلہ نہ صرف ان کی غیرت ایمانی کا مظہر ہے بلکہ حکیمانہ بھی ہے کیونکہ حکومت کے بروقت ایکشن سے ملک میں انارکی پھیلنے کا خطرہ ٹل سکتا ہے۔ اس لیے اس فیصلے کی جتنی بھی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔

اندریں صورت ہمیں چند اُمور پر بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ سوشل میڈیا پر ایسا مواد جس کے بھی سامنے آئے اسے بلا تاخیر متعلقہ حکام کے نوٹس میں لانا چاہیے اور اسے وہاں سے ہٹانے کے لیے فیس بک کی انتظامیہ سے بھی مطالبہ کرنا چاہیے بلکہ یہ مطالبہ اس کثرت سے ہونا چاہیے کہ انتظامیہ ایسا کرنے پر مجبور ہو جائے لیکن ہمیں یہ سوچ کر اس قبیح جرم کے تدارک کے لیے منصوبہ بندی کرنی چاہیے کہ فیس بک کی انتظامیہ توہین آمیز مواد ہٹانے پر بآسانی آمادہ نہیں ہوگی لہذا ہمیں متبادل آپشنز پر بھی غور کرنا ہوگا۔

ان متبادل آپشنز میں ایک تو یہ ہے کہ حکومت یا عدالت فیس بک کو پاکستان میں بند کر دے یا اسلامیان پاکستان رضا کارانہ طور پر فیس بک کا استعمال ترک کر دیں۔ ہماری دانست میں یہ اس مسئلے کا معقول اور فائدہ مند حل نہیں ہے کیونکہ اس طرح ان ملعونین کو کھلی چھٹی مل جائے گی اور وہ بلا خوف وخطر یہ توہین آمیز کاروائیاں جاری رکھیں گے۔

ثانیاً اگر فیس بک پاکستان میں بند بھی ہو جاتی ہے تو دوسرے اسلامی ممالک میں چلتی رہے گی، لہذا وہاں موجود مسلمانوں کی دل آزاری کا یہ مکروہ دھندہ چلتا رہے گا۔

ثالثاً فیس بک کو پاکستان سمیت دس ممالک میں مختلف وجوہ کی بنیاد پر ماضی میں بندش کا سامنا رہا ہے۔ان ممالک میں نارتھ کوریا، ایران، چین، کیوبا، بنگلہ دیش، مصر، شام، ماریطیس اور ویتنام شامل ہیں۔لیکن ان تمام ممالک میں یہ پابندی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔خود پاکستان میں دو ہفتے کے بعد یہ بندش ختم کر دی گئی تھی۔اس کا بنیادی سبب فیس بک کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور سوشل میڈیا کی اہمیت اور ناگزیریت تھی۔

رابعاً اگر چہ پاکستان میں فیس بک استعمال کرنے والوں کی تعداد روز افزوں ہے اور بڑھتے ہوئے یہ تعداد بیس ملین سے تجاوز کر چکی ہے لیکن یہ تعداد دنیا بھر میں فیس بک استعمال کرنے والوں کے مقابلے میں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہے۔تنہا امریکہ میں یہ تعداد 125 ملین کے لگ بھگ ہے۔فیس بک استعمال کرنے والے دس چوٹی کے ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔لہذا یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان میں اگر کوئی فیس بک کی بندش کی بات کرتا ہے تو فیس بک کی انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگے گی۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ پاکستان میں فیس بک استعمال کرنے والے دو تہائی افراد وہ ہیں جن کی عمریں 25 سال سے کم ہیں۔ہم اس پلیٹ فارم کے ذریعے ان کی تربیت کا کام کر سکتے ہیں۔مزید برآں پاکستان میں سوشل میڈیا رفتہ رفتہ قابل اعتماد ذریعہ ابلاغ کے طور پر سامنے آ رہا ہے، خصوصاً جن واقعات کی نشاندہی کرتے ہوئے ہمارا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کتراتا ہے انہیں سوشل میڈیا پر ہی نمایاں کیا جاتا ہے۔ ماضی میں ہم غازی محمد ممتاز قادری رحمہ اللہ کے جنازے کا معاملہ ہی دیکھ لیں۔ان

حقائق کی رو سے فیس بک کی بندش کے آپشن کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری متبادل آپشن یہ ہے کہ ہم سماجی رابطوں کے لیے متبادل پلیٹ فارم تشکیل دیں جہاں پر مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی آئیں اور باہمی رابطے استوار کرسکیں لیکن وہاں کسی مذہب کی توہین اور انبیاء و رسل عظام علیہم السلام کے بارے میں نفرت انگیز اور توہین آمیز مواد پھیلانے کی اجازت نہ ہو۔ یہ کام حکومتی سطح پر بھی ہوسکتا ہے اور نجی سطح پر بھی۔ نجی سطح پر یہ کام مسلمان سافٹ ویئر انجینئرز اور سرمایہ کار خصوصاً Venture capitalists مل کر کر سکتے ہیں کیونکہ اب تک متبادل پلیٹ فارم بنانے کی جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں وہ محض اس لیے کامیاب نہیں ہوسکیں کہ انہیں مؤثر بنانے کے لیے سرمایہ کاری کا فقدان رہا ہے حالانکہ یہ کام منافع بخش بھی ہے اور اس حوالے سے بھی سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے اس میں اچھی خاصی کشش موجود ہے۔

یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ ایک قابل عمل منصوبہ ہے۔ بس حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشاق کو اپنی توجہ اس جانب مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ بہتر فیچرز کے ساتھ اگر متبادل پلیٹ فارم دنیا کے سامنے آگیا تو صرف مسلمانان عالم ہی نہیں دیگر مذاہب کے اعتدال پسند لوگوں کے لیے بھی یہ غنیمت ہوگا۔ ایسا متبادل پلیٹ فارم سامنے آنے کے بعد ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ فیس بک کی انتظامیہ بھی مقابلے کے خوف سے ہی سہی اپنی ان پالیسیوں پر نظر ثانی کرنے پر ضرور آمادہ ہوگی جن کی وجہ سے اُمت مسلمہ کو اس سے شکایات ہیں۔

قانون توہین رسالت کے حوالے سے لکھے گئے ایک کالم کا جواب

﴿یہ ایک کالم محترم علامہ ابو عمار زاہد الراشدی صاحب نے ''روزنامہ پاکستان'' میں لکھا، جس کا جواب تحریر کر کے اس عاجز نے ''روزنامہ پاکستان'' کو بھجوایا لیکن بوجوہ وہاں شائع نہ ہو سکا۔ چنانچہ ہم نے اسے ''ماہنامہ سوئے حجاز'' دسمبر 2011ء کی اشاعت میں شامل کر دیا تھا اور اب اس کی اہمیت کے سبب اسے اس کتاب کا حصہ بھی بنا دیا ہے﴾

توہین رسالت کی سزا کے حوالے سے چند وضاحتیں

علامہ ابو عمار زاہد الراشدی بایں طور ہمارے بزرگ ساتھی ہیں کہ ہم تمام مسالک دیگر علمائے کرام کے ساتھ مل کر ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم سے اتحادِ اُمت کے لیے کوشاں ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے اپنے ایک کالم بعنوان ''توہین رسالت کی سزا کے حوالے سے جاری مباحثہ'' میں ہمارا ذکر بھی فرمایا۔ ہم ان کے اس لیے بھی شکرگزار ہیں کہ انہوں نے ہمارا نام بھی ان اہل علم میں شمار فرمایا جنہوں نے مذکورہ بحث کے حوالے سے سنجیدگی کے ساتھ قلم اُٹھایا۔ البتہ ہم علامہ صاحب سے چند گزارشات کرنے کی جسارت کرنا چاہتے ہیں جن کا مطلوب و مقصود بعض اُمور کی توضیح و تشریح ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے علامہ ابن عابدین شامی کے جس مؤقف کو ان کا تسامح قرار دیا ہے اس پر دلائل بھی ساتھ ہی پیش کر دیئے تھے۔ لیکن شاید علامہ صاحب کی توجہ ان دلائل کی طرف نہیں گئی۔ زیادہ بہتر تھا کہ علامہ صاحب ان دلائل کے حوالے سے اپنا نکتۂ نظر بیان فرماتے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ علامہ شامی نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ''تنبیہ الولاۃ'' لکھا ہے جس میں انہوں نے اپنے اس مؤقف کا اظہار کیا ہے کہ شاتم النبی چونکہ مرتد ہے اس لیے اسے ارتداد کے احکام کے تحت توبہ کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن کسی مؤقف پر مستقل رسالہ رقم کر دینے سے اس بات کے امکانات معدوم تو نہیں ہو جاتے کہ رسالہ رقم کرنے والے سے تسامح نہیں ہو سکتا یا اسے مغالطہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ (ت:۵۴۴ھ) نے مالکی مؤقف کی ترجمانی کرتے

ہوئے مشہور کتاب "الشفاء بتعریف حقوق المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" لکھی۔ ان کے بعد معروف شافعی فقیہ امام سبکی رحمہ اللہ (ت: ۷۵۶ھ) نے "السیف المسلول علی من سبّ الرسول" لکھی۔ یہ دونوں کتابیں لکھنے والے دو مخالف آراء اور نکتہ ہائے نظر رکھتے ہیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک کا مؤقف ہی اوفق بالکتاب والسنۃ ہونے کی بنا پر احق ہوگا۔ لہذا قرین ادب یہی ہے کہ دوسرے کے مؤقف کو تسامح قرار دیا جائے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کسی موضوع پر مستقل رسالہ لکھنا یا کتاب تالیف کرنا اس بات کی ضمانت فراہم نہیں کرتا کہ اس کے مؤلف سے کتاب یا رسالے میں زیر بحث کسی مسئلہ پر تسامح نہیں ہوسکتا۔

ہم نے امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کے چند تناقضات کا ذکر کیا تھا۔ اولاً ان کا یہ کہنا کہ احناف میں سے کسی گستاخ مسلمان یا کافر کی توبہ قبول نہ کرنے اور اسے حداً قتل کرنے کا مؤقف سب سے پہلے امام ابن بزار نے اختیار فرمایا۔ ہم نے دلائل سے یہ واضح کیا تھا کہ امام احمد بن محمد بن ناطفی حنفی رحمہ اللہ (ت: ۴۴۶ھ) نے اجناس ناطفی میں لکھا ہے کہ شاتم رسول کو حداً قتل کیا جائے گا۔ اس کا تذکرہ فتاویٰ "حسب المفتین" میں موجود ہے۔ دوسری طرف معاہد یا ذمی شاتم کے بارے میں۔ امام ابوبکر جصاص حنفی (ت: ۳۷۰ھ) بلکہ امام محمد کی تصریحات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ذمی شاتم کو قتل کرنے کا ہی مؤقف رکھتے ہیں اور آج تک احناف امام محمد رحمہ اللہ کے اسی مؤقف پر فتویٰ دیتے آرہے ہیں۔ چنانچہ اس صورت حال کے بعد اسے امام ابن عابدین شامی کا تسامح ہی قرار دیا جاسکتا ہے جو انہوں نے یہ فرمادیا کہ کسی گستاخ مسلمان یا کافر کی توبہ قبول نہ کرنے اور اسے حداً قتل

کرنے کا موقف احناف میں سے سب سے پہلے ابن بزار رحمہ اللہ (ت: ۸۲۷ھ) نے اختیار فرمایا۔

ثانیاً امام شامی فرماتے ہیں کہ مسلمان یا کافر شاتم کو حداً قتل کرنے کا موقف احناف میں سے سب سے پہلے ابن بزار نے اختیار کیا اور بعد میں آنے والے فقہائے احناف نے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اس غلط موقف کو اختیار کرلیا۔ ہم نے واضح کیا تھا کہ اگر امام شامی کی یہ بات درست مان لی جائے تو امام ابن الہمام، علامہ بدرالدین عینی، ابن نجیم، امام عبداللہ بن محمد سلیمان حنفی، حضرت ملاخسرو، امام عبد المعالی بخاری، امام حصفکی، امام تمرتاشی اور علامہ خیر الدین رملی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے فقہائے کرام پر یہ الزام آتا ہے کہ انہوں نے بلا تحقیق ابن بزار کا وہ موقف اختیار کرلیا جوان کے بقول احناف کا موقف ہی نہیں تھا۔ جبکہ ہم امام ابن الہمام رحمہ اللہ کو محقق علی الاطلاق اور ابن نجیم رحمہ اللہ کو ابوحنیفہ ثانی کہتے ہیں اور بلاشبہ ان کا علمی پایہ امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ سے بھی بلند ہے۔ ابن بزاز رحمہ اللہ وہ حنفی فقیہ ہیں جنہوں نے فتاویٰ بزاز لکھ کر فقہ حنفی پر طاری کئی صدیوں کے جمود کو توڑا تھا۔

ہم یہ بھی واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ امام ابو یوسف اور امام طحاوی کے بعد تقریباً تمام فقہائے احناف نے شاتم النبی (مسلمان ہو یا کافر) کو حداً قتل کرنے اور اس کی توبہ قبول نہ کرنے کا ہی موقف اختیار کیا ہے۔ امام طحاوی کے بعد تقریباً نوصدیوں تک فقہائے احناف تواتر کے ساتھ اسی موقف کو اختیار کررہے ہیں۔ اس کے بعد صرف اِمام ابن عابدین شامی تنہا ہی ہیں جنہوں نے دیگر متقدمین اور تمام

متاخرین فقہائے احناف کی رائے سے جداگانہ رائے اختیار کی ہے۔ان کے بعد بھی احناف میں سے خال ہی کسی نے ان کے اس مؤقف کو قبول کیا ہے تو یہ ان کے تنہا ہونے پر ہی دلالت ہے۔امام ابن عابدین شامی کا امام یوسف اور امام طحاوی کے مؤقف سے دلیل پکڑنا اور ان کا موئید ہونا اور بات ہے لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نہ تو ان کے مؤقف کی تائید ان کے معاصرین نے کی اور نہ ہی ان سے بعد میں کسی نامور حنفی محقق نے ان کے مؤقف کو اپنایا ہے۔ جہاں تک امام ابو یوسف اور امام طحاوی کے توبہ کی قبولیت والے مؤقف کا تعلق ہے تو انہوں نے اس مؤقف کو سرسری طور پر ہی بیان کیا ہے اور اس پر دلائل نہیں دیئے اور نہ ہی مستقل کتابیں لکھی ہیں۔گویا علامہ صاحب کی دلیل کے مطابق تو ان بزرگوں سے تسامح کا صدور ممکن ہے۔لہذا کسی بزرگ کے تسامح سے دلیل پکڑتے ہوئے امام ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے مستقل رسالہ بھی لکھ دیا تو اسے ان کا تو تسامح ہی کہا جائے گا اور کسی بھی صاحب علم کے ساتھ تسامح یا مغالطہ منسوب کرنے سے اس صاحب علم کا استخفاف نہیں ہوتا۔

ویسے جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ کسی صاحب علم کے کام کی علمی اہمیت اس کے مؤقف میں تسامح یا مغالطہ کی محض نشاندہی سے کم نہیں ہوتی بلکہ یہ تبھی کم ہوگی اگر اس کام میں کوئی جھول ہوگا۔مثلاً امام شامی نے متاخرین فقہاء کے بارے میں جو باتیں لکھیں اُمت نے انہیں قبول نہیں کیا بلکہ اکثر متقدمین اور متاخرین کے مؤقف ہی کو راجح قرار دیا ہے۔ہم نے تو امام شامی کے چند تناقضات کی نشاندہی ہی کی ہے

جبکہ اہل علم تو اس مسئلہ پر ان کے متعدد تناقضات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

فقہائے کرام کی ان تصریحات کے علاوہ متعدد احادیث مبارکہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گستاخ ملعونین کو جب بھی سزا دی وہ قتل سے کم نہ تھی بعض شاتمین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ کرنے پر معاف بھی فرما دیا کیونکہ یہ آپ کا حق تھا لیکن ذخیرہ کتب احادیث وسیرت میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شاتم سے توبہ کا مطالبہ فرمایا ہو۔

تاہم یہ بات خوش آئندہ ہے کہ علامہ صاحب نے مضمون کو بڑے خوبصورت انداز میں سمیٹا ہے اور محترم ڈاکٹر مفتی عبد الواحد سے اتفاق کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ عصری حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ گستاخ رسول کی سزا کو سخت سے سخت کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمیں اپنے بزرگوں اور اسلاف میں سے کسی کے اختیار کردہ مؤقف کو باطل ثابت کرنے کی بحثوں میں نہیں اُلجھنا چاہیے۔ ہم بھی ان کی اس رائے سے متفق ہیں لیکن اس گلے کے ساتھ کہ انہیں یہ بھی تعین کر دینا چاہیے تھا کہ یہ بے وقت کی راگنی کس نے چھیڑی؟ اگر وہ چند کلمات پند ونصائح اپنے فرزند ارجمند محترم حافظ محمد عمار ناصر کے لیے بھی ارشاد فرما دیتے تو ان کا مضمون متوازن ہو جاتا۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ ان کے صاحبزادے اس مسئلہ کو ایک علمی بحث کی طرز پر چھیڑتے تا کہ ان کا جواب بھی خالص علمی انداز میں دیا جاتا۔ لیکن انہوں نے اس بحث کا رخ قانون تحفظ ناموس رسالت میں تبدیلی لانے کی طرف موڑ دیا ہے

جس کی بنا پر انہیں یہ طعنے سننے پڑے کہ یہ غامدیت ہے۔ جاوید غامدی صاحب کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ وہ بعض متقدمین کے مؤقف سے استدلال کرتے ہوئے اپنی رائے قائم کریں لیکن انہیں یا کسی اور کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی اس رائے کو احناف کا مؤقف قرار دے کر پوری قوم پر مسلط کرنے کی کوشش کرے اور احناف کو اشتعال دلائے کہ تحفظ ناموس رسالت کا مروجہ قانون احناف کے مؤقف کی ترجمانی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ قانون جمہور فقہائے احناف کے راجح مؤقف کے مطابق ہی بنایا گیا ہے اور آج بھی احناف کا مفتیٰ بہ قول یہی ہے کہ گستاخ کافر یا مسلمان کو حداً قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

اہم تحریریں اور ان کے عکس

(۱) روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہونے والا اشتہار۔

(۲) ہماری طرف سے تحریر کردہ جوابی اشتہار۔

(۳) روزنامہ نوائے وقت کی طرف سے شائع ہونے والا اعتذار۔

(۴) سینٹ کی قائمہ کمیٹی کو لکھا گیا خط۔

(بحمد للہ یہ خط اور جوابی اشتہار تحریر کرنے کی سعادت بھی اس ناچیز کو حاصل ہوئی جسے محقق عصر مفتی محمد خان قادری سمیت دیگر علماء اپنی تائیدات سے نوازا)

اعتذار

نوائے وقت کی مورخہ 12 جنوری 2017ء
کی اشاعت میں جاوید اختر کے نام سے ایک
اشتہار سہواً شائع ہو گیا ہے جس میں دیئے گئے
موقف سے ادارہ ہرگز متفق نہیں۔ اس اشتہار کی
اشاعت سے دینی اور مذہبی حلقوں کی دل آزاری
ہوئی جس پر ادارہ ان سے معذرت خواہ ہے۔

(ادارہ)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲ جنوری ۔

تحفظ ناموس رسالت کا قانون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عطا فرمودہ ہے۔

روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت مؤرخہ 12 جنوری 2017ء میں سلسلہ عالیہ قادریہ چشتیہ (رجسٹرڈ) کی طرف سے جاوید اختر نامی ایک شخص نے اشتہار شائع کروایا ہے جس کی ابتداء میں رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے۔ اس اشتہار کا اصل مقصد عوام الناس کو ملک میں تحفظ ناموس رسالت کے قانون 295-c کے بارے میں گمراہ کن پراپیگنڈا کے ذریعے مضطرب کرنا تھا جس کے لیے نہ صرف اس اشتہار میں دروغ گوئی اور کتمان حق کا ارتکاب کیا گیا بلکہ صریح نصوص تک کا انکار کر دیا گیا ہے۔

پہلا جھوٹ اور بہتان : اشتہار میں پہلا جھوٹ یہ بولا گیا ہے کہ یہ قانون چند علمائے کرام نے پاس کروایا تھا حالانکہ طویل قانونی جدوجہد کے بعد ملک کے نامور وکیل محمد اسماعیل قریشی کی رٹ پر وفاقی شرعی عدالت نے تمام مکاتب فکر کے نامور علمائے کرام کے کتاب وسنت پر مبنی دلائل سن کر یہ فیصلہ دیا کہ یہ جرم ناقابل معافی ہے اور اس کی سزا حداً موت ہے۔

دوسرا جھوٹ اور بہتان : دوسرا بہتان یہ لگایا گیا کہ مروجہ قانون قرآن پاک اور آپ کی شان رحمۃ اللعالمینی کے خلاف ثابت ہوا ہے، حالانکہ یہ قانون متعدد قرآنی نصوص اور ارشادات نبوی ﷺ سے ثابت ہے جن کا ذکر تفصیلاً وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں موجود ہے مثلاً "بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی طرف سے پھٹکار ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا گیا ہے" (سورۃ احزاب، آیت ۵۷) اور حدیث مبارکہ ہے " من سب نبیاً فاقتلوہ " (جس نے حضور ﷺ کی گستاخی کی اسے قتل کر دیا جائے) وغیرہ۔ بلاشبہ اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کو شان رحمۃ اللعالمینی سے متصف فرمایا اور حضور ﷺ نے اس شان سے متصف ہوتے ہوئے متعدد گستاخوں کو موت کی سزا دی۔ لہٰذا اسے کتاب اللہ کے خلاف کہنا بہت بڑی جہالت اور جسارت ہے جبکہ اس سے نصوص صریحہ کا انکار بھی لازم آتا ہے۔

تیسرا جھوٹ اور بہتان : تیسرا جھوٹ اور بہتان یہ لگایا گیا ہے کہ بغیر ثبوت ایف آئی آر کا اندراج قرآن حکیم کی آیت مبارکہ (سورۂ حجرات آیت ۶) کی خلاف ورزی ہے۔ حالانکہ ایف آئی آر کا اندراج صرف ملزم بناتا ہے جبکہ مجرم تو وہ تفتیش میں ثابت ہوتا ہے بعد ازاں عدالت میں بھی ایسا ملزم اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا ہے۔ آیت مبارکہ کا اطلاق تفتیش کے مرحلہ پر ہو سکتا ہے۔ اگر پیش کردہ آیت مبارکہ کا وہ مفہوم لیا جائے جو مشتہر نے بیان کیا ہے تو پھر کسی بھی مقدمہ میں ایف آئی آر کا اندراج نہ ہو سکے اور کسی پر الزام لگانا ہی محال بن جائے۔

چوتھا جھوٹ اور بہتان : اشتہار میں کہا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان حضور ﷺ کی شان اقدس میں ذرہ برابر گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا کہنے سے صریح نصوص کا انکار لازم آتا ہے۔ حضور ﷺ اور کتاب اللہ کا تمسخر کرنے والوں کے بارے میں قرآن حکیم میں آتا ہے: "اور اگر تم ان سے دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی مذاق اور دل لگی کرتے تھے۔ کہو کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی مذاق کرتے تھے بہانے مت بناؤ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔" (سورۂ توبہ، آیت ۶۵، ۶۶) اللہ رب العزت نے ان گستاخان رسول وقرآن کو دوٹوک فرمادیا کہ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔ اسی طرح ابن خطل مسلمان بلکہ کاتب وحی تھا وہ بعد میں مرتد اور کافر ہو گیا تھا، تو ثابت ہوا کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض مسلمانوں نے کفر وارتداد اختیار کیا تو اس کو خارج از امکان قرار دینا صریح نصوص کے انکار کے مترادف ہے۔ اسی طرح ہر مقدمہ کو علی الاطلاق جھوٹا قرار دینا سراسر جہالت اور زیادتی ہے۔

پانچواں جھوٹ اور بہتان : پانچواں جھوٹ اور بہتان یہ لگایا گیا ہے کہ اس قانون میں کوئی رعایت نہیں حالانکہ گستاخی کرنے والے کو اصلاح کا موقع دینا چاہیے اور علمی دلیل سے اسے قائل کرنا چاہیے اگر وہ صدق دل سے توبہ کر لے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشتہر نے اس مقدس قانون کے ماخذ ومصادر اور اس پر ائمہ کرام کی تصریحات کو پڑھے بغیر ہی جہالت اور کند ذہنی کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہے۔ اس جرم کے ناقابل معافی ہونے اور مجرم کے لیے موت کی سزا ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان فرمایا لیکن گستاخ رسول ابن خطل اور اس کی محفل میں گانے والیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عام معافی کے حالات میں بھی گستاخ رسول کا معاملہ استثنائی ہے۔ اس کے بعد گستاخوں کو موقع دینے کا مشورہ دینا گستاخوں کے ساتھ ہمدردی کے مترادف ہے اور ان سے ہمدردی رضا بالکفر ہے۔ کتاب وسنت نے علامات کفر کو بیان کر دیا ہے، اگر کسی کلمہ گو میں یہ علامات موجود ہوں تو اسے کافر کہنا کتاب وسنت کی پیروی میں ہی کافر کہنا ہے۔ اشتہار میں سوالیہ انداز میں پوچھا گیا ہے کہ کسی کے خلاف توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگانا کیا توہین رسالت نہیں ہے اور کیا ایسے شخص کے لیے بھی سزائے موت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا جواب ہے کہ جھوٹا مقدمہ درج کروانے والے کے خلاف مقدمہ کی ہر سطح پر مناسب قانونی انتظام تعزیرات پاکستان کی دفعات 182، 191، 192، 194، 203 اور 211 میں پہلے سے موجود ہے۔ اس کے مطابق جھوٹے مدعی کے خلاف کاروائی ہونی چاہیے۔ توہین رسالت کا محض جھوٹا الزام لگانے والے کو سزائے موت دینا عقلاً ونقلاً درست نہیں ہے اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل اسے مسترد کر چکی ہے۔ ہاں اگر جھوٹے مقدمے کے نتیجے میں کسی بے گناہ کو سزا ہو جائے تو پھر مدعی بھی اس سزا کا حقدار ہے۔ جس کا انتظام قانون میں پہلے ہی موجود ہے۔

چھٹا جھوٹ اور بہتان : اسے انسانوں کا بنایا ہوا قانون کہنا بھی ان نصوص کے انکار کے مترادف ہے جو اس قانون کی بنیاد ہیں اور اس کے انکار سے انسان ایمان کی دولت سے محروم ہو سکتا ہے۔ جب ملک کی مجاز عدالت نے اسے کتاب وسنت کے منضبط احکام کے موافق قرار دے دیا تو اب اس میں بغیر کسی معقول دلیل شرعی کے اصلاح کی باتیں کرنا دراصل اس کے مصادر وماخذ اور خود حضور ﷺ کے فیصلوں یعنی کتاب وسنت میں اصلاح کے مشورے دینے کے مترادف ہے جو کہ شریعت کی توہین ہی کی ایک صورت ہے، اور مسلمانان پاکستان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے، فرقہ واریت پھیلانے، شریعت کا انکار کرنے اور صریح نصوص کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ یاد رہے کہ عشاق رسول ﷺ کے سرتاج امام مالک کا قول ہے کہ اس امت کو زندہ رہنے کا حق نہیں جس کے نبی کی توہین کر دی جائے۔

منجانب : کاروان اسلام، جامعہ اسلامیہ لاہور، میلاد سٹریٹ، ایچی سن ہاؤسنگ سوسائٹی نزد ایکسپو سنٹر ٹھوکر نیاز بیگ لاہور۔

Ph: 042-35300353, Cell : 0300-4001802

تحفظ ناموس رسالت کا قانون

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عطا فرمودہ ہے۔

روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت مؤرخہ 12 جنوری 2017ء میں سلسلہ عالیہ قادریہ چشتیہ (رجسٹرڈ) کی طرف سے جاوید اختر نامی ایک شخص نے اشتہار شائع کروایا ہے جس کی ابتداء میں رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف کی گئی ہے اور 10 جنوری 2017ء کو منعقد ہونے والی بڑی گیارھویں شریف کا ذکر کیا گیا۔ اس اشتہار کا اصل مقصد عوام الناس کو ملک میں تحفظ ناموس رسالت کے قانون 295-c کے بارے میں زہرناک اور گمراہ کن پراپیگنڈا کے ذریعے مضطرب اور ان کے جذبات کو مجروح کرنا تھا جس کے لیے نہ صرف اس اشتہار میں دروغ گوئی اور کتمان حق کا ارتکاب کیا گیا بلکہ صریح نصوص تک کا انکار کر دیا گیا ہے۔

پہلا جھوٹ اور بہتان: اشتہار میں پہلا جھوٹ یہ بولا گیا ہے کہ یہ قانون چند علمائے کرام نے پاس کروایا تھا حالانکہ طویل قانونی جدوجہد کے بعد ملک کے نامور وکیل محمد اسماعیل قریشی کی رٹ پر وفاقی شرعی عدالت نے تمام مکاتب فکر کے نامور علمائے کرام کے کتاب وسنت پر مبنی دلائل سن کر یہ فیصلہ دیا کہ یہ جرم ناقابل معافی ہے اور اس کی سزا حداً موت ہے۔

دوسرا جھوٹ اور بہتان: دوسرا بہتان یہ لگایا گیا کہ مروجہ قانون قرآن پاک اور آپ کی شانِ رحمۃ اللعالمینی کے خلاف ثابت ہوا ہے، حالانکہ یہ قانون متعدد قرآنی نصوص اور ارشادات نبوی ﷺ سے ثابت ہے جن کا ذکر تفصیلاً

وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں موجود ہے مثلاً ''بلاشبہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی طرف سے پھٹکار ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا گیا ہے'' (سورۂ احزاب، آیت ۵۷) اور حدیث مبارکہ ہے ''**من سب نبیاً فاقتلوہ**'' (جس نے حضور ﷺ کی گستاخی کی اسے قتل کر دیا جائے) وغیرہ۔ بلاشبہ اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کو شان رحمۃ اللعالمینی سے متصف فرمایا اور حضور ﷺ نے اس شان سے متصف ہوتے ہوئے متعدد گستاخوں کو قتل کرنے کا حکم بھی دیا۔ لہذا اسے کتاب اللہ کے خلاف کہنا بہت بڑی جہالت اور جسارت ہے جبکہ اس سے نصوص صریحہ کا انکار لازم آتا ہے جو فی نفسہ کفر وارتداد ہے۔

تیسرا جھوٹ اور بہتان : تیسرا جھوٹ اور بہتان یہ لگایا گیا ہے کہ بغیر ثبوت ایف آئی آر کا اندراج قرآن حکیم کی آیت مبارکہ (سورۂ حجرات آیت ۶) کی خلاف ورزی ہے۔ حالانکہ ایف آئی آر کا اندراج صرف ملزم بناتا ہے جبکہ مجرم تو وہ تفتیش میں ثابت ہوتا ہے بعد ازاں عدالت میں بھی ایسا ملزم اپنی بے گناہی ثابت کر سکتا ہے۔ آیت مبارکہ کا اطلاق تفتیش کے مرحلہ پر ہو سکتا ہے جس کے نتیجہ میں کسی ملزم کو مجرم یا بری قرار دیا جاتا ہے۔

اگر پیش کردہ آیت مبارکہ کا وہ مفہوم لیا جائے جو مشتہر نے بیان کیا ہے تو پھر کسی بھی مقدمہ میں ایف آئی آر کا اندراج نہ ہو سکے اور کسی پر الزام لگانا ہی محال بن جائے۔ اگر آیت مبارکہ کے مشتہر کے بیان کردہ جہالت پر مبنی مفہوم ہی کو درست سمجھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق صرف تحفظ ناموس رسالت کے قانون ہی پر کیوں جائز لگا؟ کیا پیش کردہ آیت کریمہ سینکڑوں قوانین کے تحت اندراج مقدمہ پر لاگو نہیں ہوگی؟

چوتھا جھوٹ اور بہتان : اشتہار میں کہا گیا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ

مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں ذرہ برابر گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ایسا کہنے سے صریح نصوص کا انکار لازم آتا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کتاب اللہ کا استہزا کرنے والوں کے بارے میں قرآن حکیم میں آتا ہے "اور اگر تم ان سے دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی مذاق اور دل لگی کرتے تھے۔کہو کیا تم خدا اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول سے ہنسی مذاق کرتے تھے بہانے مت بناؤ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔" (سورۂ توبہ، آیت ۶۵، ۶۶)

اللہ رب العزت نے ان گستاخان رسول و قرآن کو دوٹوک فرمادیا کہ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو چکے ہو۔

اسی طرح ابن خطل مسلمان بلکہ کاتب وحی تھا وہ بعد میں مرتد اور کافر ہو گیا تھا۔تو ثابت ہوا کہ خود رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بعض مسلمانوں نے کفر وارتداد اختیار کیا تو اس کو خارج از امکان قرار دینا وہ بھی اس دور زوال میں صریح نصوص کے انکار کے مترادف ہے۔متعدد جھوٹے مقدمات کا خارج ہونا تو یہ ثابت کرتا ہے کہ اس حوالے سے تفتیش کا معیار بلند ہے اور جن پر جھوٹا الزام عائد کیا گیا وہ بچ نکلے۔اس لیے ہر مقدمہ کو علی الاطلاق جھوٹا قرار دینا سراسر جہالت اور زیادتی ہے۔

پانچواں جھوٹ اور بھتان : پانچواں جھوٹ اور بہتان یہ لگایا گیا ہے کہ اس قانون میں کوئی رعایت نہیں حالانکہ گستاخی کرنے والے کو اصلاح کا موقع دینا چاہیے اور علمی دلیل سے اسے قائل کرنا چاہیے اگر وہ صدق دل سے توبہ کر لے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ مشتہر نے اس مقدس قانون کے ماخذ و

یہ نتیجہ اخذ کرلیا ہے۔اس جرم کے ناقابل معافی ہونے اور مجرم کے لیے موت کی سزا ہونے پر امت کا اجماع ہو چکا ہے۔حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان فرمایا لیکن گستاخ رسول ابن خطل اور اس کی محفل میں گانے والیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ عام معافی کے حالات میں بھی گستاخ رسول کا معاملہ استثنائی ہے۔اس کے بعد گستاخوں کو موقع دینے کا مشورہ دینا گستاخوں کے ساتھ ہمدردی کے مترادف ہے اور ان سے ہمدردی رضا بالکفر ہے۔کتاب وسنت نے علامات کفر کو بیان کر دیا ہے، اگر کسی کلمہ گو میں یہ علامات موجود ہوں تو اسے کافر کہنا کتاب وسنت کی پیروی میں ہی کافر کہنا ہے،ضروریات دین کے انکار کے بعد بھی اس کی تکفیر سے رک جانا خود رک جانے والے صاحب علم کے لیے باعث ضرر ہے کیونکہ جس طرح بلاوجہ کلمہ گو کی تکفیر کا ضرر ہے اس سے کہیں بڑھ کر کسی میں علامات کفر پائے جانے کے بعد اسے مسلمان قرار دینے اور سمجھنے کا ضرر ہے۔

اشتہار میں سوالیہ انداز میں پوچھا گیا ہے کہ کسی کے خلاف توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگانا کیا توہین رسالت نہیں ہے اور کیا ایسے شخص کے لیے بھی سزائے موت نہیں ہونی چاہیے۔اس کا جواب ہے کہ جھوٹا مقدمہ درج کروانے والے کے خلاف مقدمہ کی ہر سطح پر مناسب قانونی انتظام تعزیرات پاکستان میں پہلے سے موجود ہے۔ اس کے مطابق جھوٹے مدعی کے خلاف کاروائی ہونی چاہیے حتیٰ کہ اگر عدالتی کاروائی میں کسی کو جھوٹے مقدمے کے تحت عمر قید یا 7 سال کی سزا ہوتی ہے یا اسے سزائے موت دی جاتی ہے اور بعد ازاں مقدمہ کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو تعزیرات پاکستان کی دفعہ 194 کے تحت نہ صرف اس جھوٹے مقدمے کے مدعی بلکہ جھوٹے

گواہان کو وہی سزا دی جائے گی ۔ توہین رسالت کا محض جھوٹا الزام لگانے والے کو سزائے موت دینا عقلاً ونقلاً درست نہیں ہے اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل اسے مسترد کر چکی ہے۔ ہاں اگر جھوٹے مقدمے کے نتیجے میں کسی بے گناہ کو سزا ہو جائے تو پھر مدعی بھی اس سزا کا حقدار ہے جس کا انتظام قانون میں پہلے ہی موجود ہے۔

چھٹا جھوٹ اور بہتان : اسے انسانوں کا بنایا ہوا قانون کہنا بھی ان نصوص کے انکار کے مترادف ہے جو اس قانون کی بنیاد ہیں اور یہ انکار بلاشبہ باعث کفر وارتداد ہے۔ جب ملک کی مجاز عدالت نے اسے کتاب وسنت کے منضبط احکام کے موافق قرار دے دیا تو اب اس میں اصلاح کی باتیں کرنا دراصل اس کے مصادر و ماخذ اور خود حضور ﷺ کے فیصلوں یعنی کتاب وسنت میں اصلاح کے مشورے دینے کے مترادف ہے جو کہ شریعت کی کھلی توہین ہے، اور مسلمانان پاکستان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے ،فرقہ واریت پھیلانے ،شریعت کا انکار کرنے اور صریح نصوص کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ یاد رہے کہ عشاق رسول ﷺ کے سرتاج امام مالک کا قول ہے کہ اس امت کو زندہ رہنے کا حق نہیں جس کے نبی کی توہین کر دی جائے۔

محترم سینیٹر فرحت اللہ بابر صاحب

سینیٹ پاکستان

اسلام آباد

عنوان

عنوان: قانون توہین رسالت پر تجاویز کا جائزہ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

روزنامہ جنگ کی اشاعت مؤرخہ 13 جنوری 2017ء کی وساطت سے معلوم ہوا کہ سینیٹ پاکستان کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق قانون توہین رسالت کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے چوبیس سالہ پرانی تجاویز پر غور وفکر کرنے لگی ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ اس قانون کے تحت جھوٹے مقدمات کی روک تھام کے لیے غور وفکر کیا جائے اور اگر ضروری سمجھا جائے تو ضوابطی قوانین (Procedural laws) میں تبدیلیاں بھی لائی جائیں لیکن اس سے قبل یہ جائزہ ضرور لیا جائے کہ جھوٹے مدعیان سے نمٹنے کے لیے مروجہ قوانین میں پہلے سے ہی گنجائش موجود ہے۔

اس ضمن میں مقدمے کے مختلف مراحل پر اس کے جھوٹا ثابت ہونے پر تعزیرات پاکستان کی دفعات 182، 191، 192، 194، 203 اور 211 کے تحت جھوٹے مدعی کے خلاف مناسب اور مؤثر کاروائی کی جاسکتی ہے۔ آپ بھی ان

دفعات کا اچھی طرح جائزہ لے لیں۔ یہ بات بھی قائمہ کمیٹی کے پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اس سے قبل تفتیش کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ضوابطی قوانین میں پہلے بھی ترمیم کی جا چکی ہے جس کی رو سے 295(c) کے تحت درج ہونے والی ایف۔آئی۔آر کی تفتیش سپریٹنڈنٹ پولیس سے کم سطح کا آفیسر نہیں کر سکتا۔ اس ترمیم کے مثبت اثرات عیاں ہیں کیونکہ دوران تفتیش ملزمان کی کثیر تعداد کو بے گناہ قرار دیا گیا ہے اور بالعموم انہی ملزموں کے چالان عدالت میں بھجوائے جاتے ہیں جنہوں نے فی الواقع یہ جرم کیا ہوتا ہے۔

مزید بہتری لانے کے لیے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ توہین رسالت کے وقوعہ کے بعد جو بھی درخواست برائے اندراج مقدمہ متعلقہ تھانہ میں آئے تو ملزم کو پولیس بلا تردد اپنی حفاظت میں لے لے لیکن ایف۔آئی۔آر کا اندراج نہ کرے اور معاملہ کی شرعی حیثیت کی جانچ کے لیے سرکاری سطح پر تمام مسالک کے جید علماء پر مشتمل ایک مستقل بورڈ بنا دیا جائے۔ متعلقہ تھانیدار پابند ہو کہ وہ یہ معاملہ اس بورڈ تک 48 گھنٹوں کے اندر اندر پہنچا دے۔ بورڈ سات یوم کے اندر اندر شرعی اعتبار سے معاملہ کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ واپس تھانے دار کو بھجوا دے۔ بورڈ اندراج مقدمہ کی سفارش کرے تو ملزم کے خلاف ایف۔آئی۔آر درج کر لی جائے ورنہ اسے باعزت طور پر چھوڑ دیا جائے۔ اس صورت میں جھوٹے مدعیان و گواہان کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 182 کے تحت کاروائی کی گنجائش پہلے ہی قانون میں موجود ہے۔ مجوزہ انتظام کو

قانونی شکل دینے سے جھوٹے مقدمات پر قابو پانا یقینی اور سہل ہوسکتا ہے۔

آپ کے اخباری بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ سینیٹ پاکستان کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق اس تجویز پر بھی غور کرے گی کہ 295.c کے تحت سزا کو کم کر کے سزائے موت کی بجائے عمر قید میں تبدیل کر دیا جائے۔

ہماری گزارش ہے کہ اس پر غور وفکر مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر سعی لاحاصل ثابت ہوگا۔

1۔ 1991 تک (c)295 میں متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ موجود تھے۔ طویل قانونی جدوجہد کے بعد بالآخر وفاقی شرعی عدالت نے عمر قید کی متبادل سزا کو غیر اسلامی قرار دیا اور حکومت پاکستان کو حکم دیا گیا کہ وہ 30 اپریل 1991ء تک عمر قید کی سزا کو (c)295 کے متن میں سے حذف کر دے۔ حکومت نے ابتدأ اس فیصلے کے خلاف شریعت اپیل نمبر 5 کے تحت پٹیشن نمبر 1 کی رو سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلٹ بینچ میں اپیل دائر کر دی لیکن موجودہ وزیراعظم میاں نواز شریف جو اس وقت بھی وزیراعظم تھے انہوں نے یہ اپیل واپس لے لی۔

اسی طرح دوسری اپیل وفاقی شرعی عدالت میں پٹیشن نمبر 43/1 آف 1993 کے تحت علامہ بشپ دانی ایل تسلیم نے دائر کی جس میں وفاقی شرعی عدالت

کے مذکورہ بالا فیصلے کو اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا کہ یہ فیصلہ اسلام کے احکام کے منافی ہے۔
چنانچہ اسے جسٹس ڈاکٹر فدا محمد کی سربراہی میں فل بینچ نے سنا اور 8 جنوری 1994 کو اس پٹیشن کو بھی خارج کرنے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ علامہ بشپ دانی ایل تسلیم نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلٹ بینچ میں 1994 میں اپیل نمبر 2 دائر کی جسے فل کورٹ نے عدم پیروی کی بنیاد پر مؤرخہ 21 اپریل 2009 کو خارج کر دیا اور یوں یہ معاملہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے ذریعے طے پا گیا کہ پاکستان میں نافذ العمل قانون (c)295 کے تحت کتاب وسنت کی روشنی میں توہین رسالت کی سزا صرف اور صرف موت ہوگی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان فیصلوں کے بعد بھی تعزیرات پاکستان کی دفعہ (c)295 میں سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف نہ کیے گئے جس پر فیڈرل شریعت کورٹ میں پٹیشن نمبر 08/01/2007 اور 09/01/2010 دائر کی گئیں جن میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے 30 اپریل 1991 کے فیصلے کے بعد تعزیرات پاکستان کی (c)295 کے متن سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کرنے کے احکام جاری کیے جائیں۔ چنانچہ مؤرخہ 4 اکتوبر 2013 کو وفاقی حکومت نے سیکرٹری لا، جسٹس اینڈ ہیومین رائٹس کے ذریعے ایک رپورٹ عدالت میں جمع کروائی جس میں یہ واضح کیا گیا کہ اگست 1991 میں سینیٹ میں ایک بل پیش کیا گیا تھا جس کے ذریعے (c)295 تعزیرات پاکستان میں سے عمر قید کی سزا کے الفاظ حذف کرنے کی بات کی گئی تھی۔ سینیٹ نے یہ بل منظور کر لیا تھا اور پھر اسے قومی اسمبلی کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن قومی اسمبلی نے اسے 90 دن کے اندر منظور نہ

کیا۔اس کے باوجود آئین پاکستان کے آرٹیکل (d)203 کی دفعہ 3 کے پیرا گراف (ط) کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر (c)295 سے سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کرنے کی حد تک عمل درآمد ہو چکا ہے۔

عدالت نے اپیل کنندہ کے وکیل کو بھی سنا اور اس کے بعد سیکرٹری منسٹری آف لا، جسٹس اور ہیومین رائٹس کو ہدایت جاری کی کہ وہ زیر بحث فیصلے پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کے لیے ضروری اقدام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ سزائے عمر قید کے الفاظ (c)295 تعزیرات پاکستان کے متن سے حذف کر دیئے جائیں اور تمام ہائی کورٹس کے رجسٹرار حضرات کو ہدایت کی جائے کہ وہ اسے تمام جوڈیشنل آفیسرز تک پہنچا دیں۔ یہ فیصلہ 4 دسمبر 2013 کو سنایا گیا اور PLD.2014 شریعت کورٹ 18 کے تحت والیم L.xvi کے صفحات 18 تا 23 پر درج ہے۔قدرے تفصیل کے ساتھ اس قانون کی تاریخ قلمبند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو واضح ہو جائے کہ (c)295 میں سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کروانے کے لیے کن کن مراحل سے گزرا گیا۔اب اگر قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق دوبارہ اسی سزا پر غور کرتی ہے جسے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت اور خود سینیٹ جیسے ادارے نے بھی مسترد کرتے ہوئے (c)295 میں سے سزائے عمر قید کو حذف کرنے کا فیصلہ دیا ہوا ہے تو یہ نہ صرف سعی لاحاصل ہوگی بلکہ یہ ایک طرح سے ہمارے ہاں ہونے والی قانون سازی کے عمل کا مذاق اڑانے کے مترادف بھی ہوگا۔

2 ۔توہین رسالت کی شرعی سزا صرف اور صرف موت ہے اس پر قرآن حکیم کی

درجنوں نصوص، احادیث مبارکہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد فیصلے شاہد ہیں جن کا احاطہ تفصیل کے ساتھ وفاقی شرعی عدالت نے اپنے 1991 کے فیصلے میں کر دیا ہے۔

3۔ اسی سزا پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا تعامل رہا اور ائمہ مجتہدین نے اسے اختیار کیا بلکہ اہل علم نے اسی پر اُمت کا اجماع نقل کیا ہے۔

4۔ یہ نازک اور حساس معاملہ ہے جس کا براہ راست تعلق اُمت کے جذبات کے ساتھ ہے۔ ماضی میں اس قانون کو ختم کرانے کے حوالے سے جو بھی کوششیں کی گئیں وہ کامیاب تو نہ ہو سکیں لیکن ملک میں امن وامان ختم کرنے اور فساد پھیلانے کا سبب ضرور بنیں۔

اندریں حالات ملی مجلس شرعی کے علماء آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ Substantive law یعنی 295(c) میں کسی قسم کی ترمیم خصوصاً اس کی سزا کم تر کرنا شرعی، قانونی اور آئینی طور پر ایک درست اقدام نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اس سے ملک کا امن وامان ایک دفعہ پھر خراب ہو جائے گا۔ ویسے بھی جھوٹے مقدموں کا خاتمہ Procedural laws یعنی ضوابطی قوانین میں بہتری لانے سے تو ہو سکتا ہے لیکن سزا کی کمی بیشی سے نہیں اور نہ ہی جھوٹے مقدمات کا تعلق سزا کی مقدار اور Substantive law سے بنتا ہے۔

یاد رہے کہ ملی مجلس شرعی تمام مسالک کے متوازن سوچ اور معتدل فکر کے حامی جید علمائے کرام کا پلیٹ فارم ہے جو اہم ملکی وقومی مسائل کا شرعی جائزہ لیتے ہیں اور اپنا دینی وملی فریضہ سمجھتے ہوئے اپنی سفارشات متعلقہ حکام تک پہنچاتے ہیں۔ مجلس اس

سے قبل وفاقی شرعی عدالت کی طرف سے مسئلہ سود پر اُٹھائے گئے 14 سوالات کے
جوابات تحریر کر کے رجسٹرار وفاقی شرعی عدالت کو بھجوا چکی ہے اور اسی طرح انسداد فحاشی
کے حوالے سے ایک رٹ پر چیف جسٹس آف پاکستان کے ایک تبصرے کے جواب
میں فحاشی کی تعریف اور اس کے دائرہ کے حوالے سے بھی اپنی سفارشات چیف جسٹس
آف پاکستان کو بھجوا چکی ہے۔

انسداد قتل غیرت کے حوالے سے حالیہ قانونی ترمیم کو متوازن بنانے کے
لیے بھی اپنی سفارشات مرتب کر چکی ہے۔ مطبوعہ کام کی کاپیاں لف ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ علمائے کرام کی ان گزارشات کا بغور جائزہ لیں گے اور یہ صد
ا بصحرا ثابت نہیں ہوں گی۔ اگر اس مسئلہ میں قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق کو مجلس کے
علمائے کرام کی معاونت درکار ہو تو ہمیں یہ خدمت سرانجام دے کر خوشی ہو گی۔

نوٹ: یہ خط موصول ہونے کے بعد سینیٹر فرحت اللہ بابر نے بھی ملی مجلس شرعی کے سربراہ
محقق عصر مفتی محمد خان قادری سے بذریعہ فون رابطہ کیا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے
لاہور میں ان سے ملاقات کی خواہش بھی ظاہر کی تھی تا کہ مذکورہ مسئلہ سمیت دیگر زیر غور
معاملات پر بھی جید علماء کرام سے راہنمائی حاصل کی جا سکے۔ انہوں نے یہ یقین دہانی
بھی کرائی کہ قائمہ کمیٹی کے تمام اراکین اور۔۔۔ پرسن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی
طرف سے سامنے آنے والی تمام تر تجاویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کیا جائے گا اور ان
سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ انہوں نے کلمات تشکر کے طور پر یہ بھی بیان کیا کہ
الحمد للہ پہلی مرتبہ علماء کرام کی طرف سے ٹھنڈی اور تازہ ہوا کا جھونکا آیا ہے۔

ملی مجلس شرعی کی طرف سے سینیٹ کا لکھا جانے والا خط

مجلسِ منتظمہ

☆ مفتی محمد خان قادری (صدر) ☆ مولانا زاہد الراشدی (سینئر نائب صدر) ☆ مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی (نائب صدر) ☆ مولانا عبد المالک، منصورہ (نائب صدر) ☆ علامہ نیاز حسین نقوی (نائب صدر) ☆ مولانا ڈاکٹر محمد امین (ناظم اعلیٰ) ☆ مولانا خلیل الرحمٰن قادری (نائب ناظم اعلیٰ) ☆ مولانا شیخ محمد یعقوب (ناظم نشر و اشاعت) ☆ مولانا راغب حسین نعیمی (ناظم مالیات) ☆ مولانا حافظ فضل الرحیم (رکن) ☆ مولانا عبد الرؤف فاروقی (رکن) ☆ علامہ ڈاکٹر محمد حسین (رکن) ☆ حافظ عاکف سعید (رکن) ☆ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ (رکن)

ملی مجلس شرعی کی طرف سے سینیٹ کو لکھا جانے والے خط کا عکس

محترم سینیٹر فرحت اللہ بابر صاحب
سینیٹ پاکستان
اسلام آباد

عنوان

عنوان: قانون توہین رسالت پر تجاویز کا جائزہ

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

روزنامہ جنگ کی اشاعت مؤرخہ 13 جنوری 2017ء کی وساطت سے معلوم ہوا کہ سینیٹ پاکستان کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق قانون توہین رسالت کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے چوبیس سالہ پرانی تجاویز پر غور و فکر کرنے لگی ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ اس قانون کے تحت جھوٹے مقدمات کی روک تھام کے لیے غور و فکر کیا جائے اور اگر ضروری سمجھا جائے تو ضوابطی قوانین (Procedural laws) میں تبدیلیاں بھی لائی جائیں لیکن اس سے قبل یہ جائزہ ضرور لیا جائے کہ جھوٹے مدعیان سے نمٹنے کے لیے مروجہ قوانین میں پہلے سے ہی گنجائش موجود ہے۔

اس ضمن میں مقدمے کے مختلف مراحل پر اس کے جھوٹا ثابت ہونے پر تعزیرات پاکستان کی دفعات 182,191,192,194,203 اور 211 کے تحت جھوٹے مدعی کے خلاف مناسب اور مؤثر کاروائی کی جا سکتی ہے۔ آپ بھی ان دفعات کا اچھی طرح جائزہ لے لیں۔ یہ بات بھی قائمہ کمیٹی کے پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اس

سے قبل تفتیش کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ضوابطی قوانین میں پہلے بھی ترمیم کی جا چکی ہے جس کی رو سے 295(c) کے تحت درج ہونے والی ایف۔آئی۔آر کی تفتیش سپرینٹنڈنٹ پولیس سے کم سطح کا آفیسر نہیں کر سکتا۔ اس ترمیم کے مثبت اثرات عیاں ہیں کیونکہ دوران تفتیش ملزمان کی کثیر تعداد کو بے گناہ قرار دیا گیا ہے اور بالعموم انہی ملزموں کے چالان عدالت میں بھجوائے جاتے ہیں جنہوں نے فی الواقع یہ جرم کیا ہوتا ہے۔

مزید بہتری لانے کے لیے ہم یہ تجویز کرتے ہیں کہ توہین رسالت کے وقوعہ کے بعد جو بھی درخواست برائے اندراج مقدمہ متعلقہ تھانہ میں آئے تو ملزم کو پولیس بلا تردد اپنی حفاظت میں لے لے لیکن ایف۔آئی۔آر کا اندراج نہ کرے اور معاملہ کی شرعی حیثیت کی جانچ کے لیے سرکاری سطح پر تمام مسالک کے جید علماء پر مشتمل ایک مستقل بورڈ بنا دیا جائے۔ متعلقہ تھانیدار پابند ہو کہ وہ یہ معاملہ اس بورڈ تک 48 گھنٹوں کے اندر اندر پہنچا دے۔ بورڈ سات یوم کے اندر اندر شرعی اعتبار سے معاملہ کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ واپس تھانے دار کو بھجوا دے۔ بورڈ اندراج مقدمہ کی سفارش کرے تو ملزم کے خلاف ایف۔آئی۔آر درج کر لی جائے ورنہ اسے باعزت طور پر چھوڑ دیا جائے۔ اس صورت میں جھوٹے مدعیان و گواہان کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 182 کے تحت کاروائی کی گنجائش پہلے ہی قانون میں موجود ہے۔ مجوزہ انتظام کو قانونی شکل دینے سے جھوٹے مقدمات پر قابو پانا یقینی اور سہل ہو سکتا ہے۔

آپ کے اخباری بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ سینیٹ پاکستان کی قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق اس تجویز پر بھی غور کرے گی کہ 295.c کے تحت سزا کو کم کر کے سزائے موت کی بجائے عمر قید میں تبدیل کر دیا جائے۔

ہماری گزارش ہے کہ اس پر غور و فکر مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر سعی لاحاصل ثابت ہوگا۔

1۔ 1991 تک 295(c) میں متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ موجود تھے۔ طویل قانونی جدوجہد کے بعد بالآخر وفاقی شرعی عدالت نے عمر قید کی متبادل سزا کو غیر اسلامی قرار دیدیا اور حکومت پاکستان کو حکم دیا گیا کہ وہ 30 اپریل 1991ء تک عمر قید کی سزا کو 295(c) کے متن میں سے حذف کر دے۔ حکومت نے ابتداً اس فیصلے کے خلاف شریعت اپیل نمبر 5 کے تحت پٹیشن نمبر 1 کی رو سے سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت لپیلٹ بینچ میں اپیل دائر کر دی لیکن موجودہ وزیر اعظم میاں نواز شریف جو اس وقت بھی وزیر اعظم تھے انہوں نے یہ اپیل واپس لے لی۔ اسی طرح دوسری اپیل وفاقی شرعی عدالت میں پٹیشن نمبر 43/1 آف 1993 کے تحت علامہ بشپ دانی ایل تسلیم نے دائر کی جس میں وفاقی شرعی عدالت کے مذکورہ بالا فیصلے کو اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا کہ یہ فیصلہ اسلام کے احکام کے منافی ہے۔ چنانچہ اسے جسٹس ڈاکٹر فدا محمد کی سربراہی میں فل بینچ نے سنا اور 8 جنوری 1994 کو اس پٹیشن کو بھی خارج کرنے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ علامہ بشپ دانی ایل تسلیم نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت لپیلٹ بینچ میں 1994 میں اپیل نمبر 2 دائر کی جسے فل کورٹ نے عدم پیروی کی بنیاد پر مؤرخہ 21 اپریل 2009 کو خارج کر دیا اور یوں یہ معاملہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے ذریعے طے پا گیا کہ پاکستان میں نافذ العمل قانون 295(c) کے تحت کتاب و سنت کی روشنی میں توہین رسالت کی سزا صرف اور صرف موت ہوگی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان فیصلوں کے بعد بھی تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295(c) میں سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف نہ کیے گئے جس پر فیڈرل شریعت کورٹ میں پٹیشن نمبر 08/01/2007 اور

09/01/2010 دائر کی گئیں جن میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ وفاقی شرعی عدالت کے 30 اپریل 1991 کے فیصلے کے بعد تعزیرات پاکستان کی (c)295 کے متن سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کرنے کے احکام جاری کیے جائیں۔ چنانچہ مورخہ 4 اکتوبر 2013 کو وفاقی حکومت نے سیکرٹری لا، جسٹس اینڈ ہیومین رائٹس کے ذریعے ایک رپورٹ عدالت میں جمع کروائی جس میں یہ واضح کیا گیا کہ اگست 1991 میں سینیٹ میں ایک بل پیش کیا گیا تھا جس کے ذریعے (c)295 تعزیرات پاکستان میں سے عمر قید کی سزا کے الفاظ حذف کرنے کی بات کی گئی تھی۔ سینیٹ نے یہ بل منظور کر لیا تھا اور پھر اسے قومی اسمبلی کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن قومی اسمبلی نے اسے 90 دن کے اندر منظور نہ کیا۔ اس کے باوجود آئین پاکستان کے آرٹیکل (d)203 کی دفعہ 3 کے پیراگراف (ط) کے تحت وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر (c)295 سے سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کرنے کی حد تک عمل درآمد ہو چکا ہے۔ عدالت نے اپیل کنندہ کے وکیل کو بھی سنا اور اس کے بعد سیکرٹری منسٹری آف لا، جسٹس اور ہیومین رائٹس کو ہدایت جاری کی کہ وہ زیر بحث فیصلے پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کے لیے ضروری اقدام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ سزائے عمر قید کے الفاظ (c)295 تعزیرات پاکستان کے متن سے حذف کر دیئے جائیں اور تمام ہائی کورٹس کے رجسٹرار حضرات کو ہدایت کی جائے کہ وہ اسے تمام جوڈیشل آفیسرز تک پہنچا دیں۔ یہ فیصلہ 4 دسمبر 2013 کو سنایا گیا اور PLD.2014 شریعت کورٹ 18 کے تحت والیم L.xvi کے صفحات 18 تا 23 پر درج ہے۔ قدرے تفصیل کے ساتھ اس قانون کی تاریخ قلمبند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو واضح ہو جائے کہ (c)295 میں سے متبادل سزائے عمر قید کے الفاظ حذف کروانے کے لیے کن کن مراحل سے گزرا گیا۔ اب اگر قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق دوبارہ اسی سزا پر غور کرتی ہے جسے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت اور خود سینیٹ جیسے ادارے نے بھی مسترد کرتے ہوئے (c)295 میں سے سزائے عمر قید کو حذف کرنے کا فیصلہ دیا ہوا ہے تو یہ نہ صرف سعی لاحاصل ہو گی بلکہ یہ ایک طرح سے ہمارے ہاں ہونے والی قانون سازی کے عمل کا مذاق اڑانے کے مترادف بھی ہو گا۔

2۔ توہین رسالت کی شرعی سزا صرف اور صرف موت ہے اس پر قرآن حکیم کی درجنوں نصوص، احادیث مبارکہ اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد فیصلے شاہد ہیں جن کا احاطہ تفصیل کے ساتھ وفاقی شرعی عدالت نے اپنے 1991 کے فیصلے میں کر دیا ہے۔

3۔ اسی سزا پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کا تعامل رہا اور ائمہ مجتہدین نے اسے اختیار کیا بلکہ اہل علم نے اسی پر اُمت کا اجماع نقل کیا ہے۔

4۔ یہ نازک اور حساس معاملہ ہے جس کا براہ راست تعلق اُمت کے جذبات کے ساتھ ہے۔ ماضی میں اس قانون کو ختم کرانے کے حوالے سے جو بھی کوششیں کی گئیں وہ کامیاب تو نہ ہو سکیں لیکن ملک میں امن وامان ختم کرنے اور فساد پھیلانے کا سبب ضرور بنیں۔

اندریں حالات ملی مجلس شرعی کے علماء آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ Substantive law یعنی 295(c) میں کسی قسم کی ترمیم خصوصاً اس کی سزا کم تر کرنا شرعی، قانونی اور آئینی طور پر ایک درست اقدام نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اس سے ملک کا امن وامان ایک دفعہ پھر خراب ہو جائے گا۔ ویسے بھی جھوٹے مقدموں کا خاتمہ Procedural laws یعنی ضوابطی قوانین میں بہتری لانے سے تو ہوسکتا ہے لیکن سزا کی کمی بیشی سے نہیں اور نہ ہی جھوٹے مقدمات کا تعلق سزا کی مقدار اور Substantive law سے بنتا ہے۔

یادر ہے کہ ملی مجلس شرعی تمام مسالک کے متوازن سوچ اور معتدل فکر کے حامی جید علمائے کرام کا پلیٹ فارم ہے جو اہم ملکی وقومی مسائل کا شرعی جائزہ لیتے ہیں اور اپنا دینی وملی فریضہ سمجھتے ہوئے اپنی سفارشات متعلقہ حکام تک پہنچاتے ہیں۔ مجلس اس سے قبل وفاقی شرعی عدالت کی طرف سے مسئلہ سود پر اُٹھائے گئے 14 سوالات کے جوابات تحریر کر کے رجسٹرار وفاقی شرعی عدالت کو بھجوا چکی ہے اور اسی طرح انسداد فحاشی کے حوالے سے ایک رٹ پر چیف جسٹس آف پاکستان کے ایک تبصرے کے جواب میں فحاشی کی تعریف اور اس کے دائرہ کے حوالے سے بھی اپنی سفارشات چیف جسٹس آف پاکستان کو بھجوا چکی ہے۔

انسداد قتل غیرت کے حوالے سے حالیہ قانونی ترمیم کو متوازن بنانے کے لیے بھی اپنی سفارشات مرتب کر چکی ہے۔ مطبوعہ کام کی کاپیاں لف ہیں۔

اُمید ہے کہ آپ علمائے کرام کی ان گزارشات کا بغور جائزہ لیں گے اور یہ صدا بصحرا ثابت نہیں ہوں گی۔ اگر اس مسئلہ میں قائمہ کمیٹی برائے انسانی حقوق کو مجلس کے علمائے کرام کی معاونت درکار ہو تو ہمیں یہ خدمت سرانجام دے کر خوشی ہوگی۔

دعا گو

(مفتی) محمد خان قادری
صدر ملی مجلس شرعی پاکستان
0321.9494173

ڈاکٹر محمد امین
ناظم اعلیٰ ملی مجلس شرعی پاکستان
0300.4354673

(علامہ) محمد خلیل الرحمٰن قادری
نائب ناظم اعلیٰ ملی مجلس شرعی پاکستان
0300.4001802

mail:mkhlilurehman@gmaail.com

کاپی برائے اطلاع۔ چیئرمین سینیٹ ودیگر
اراکین قائمہ کمیٹی برائے ہیومین رائٹس

نوٹ: یہ خط موصول ہونے کے بعد سینیٹر فرحت اللہ بابر نے بھی ملی مجلس شرعی کے سربراہ محقق عصر مفتی محمد خان قادری سے بذریعہ فون رابطہ کیا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لاہور میں ان سے ملاقات کی خواہش بھی ظاہر کی تھی تاکہ

مذکورہ مسئلہ سمیت دیگر زیر غور معاملات پر بھی جید علماء کرام سے راہنمائی حاصل کی جا سکے۔ انہوں نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ قائمہ کمیٹی کے تمام اراکین اور ۔۔۔ پرسن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی طرف سے سامنے آنے والی تمام تر تجاویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کیا جائے گا اور ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ انہوں نے کلمات تشکر کے طور پر یہ بھی بیان کیا کہ الحمدللہ پہلی مرتبہ علماء کرام کی طرف سے ٹھنڈی اور تازہ ہوا کا جھونکا آیا ہے۔